

خالی پٹاریوں کی مَداری

اقبالِ متین

فُصرت پبلشرز - لکھنؤ - ۳

خالی پٹاریوں کی مداری

(افسانے)

اقبالِ ستین

نصرت پبلشرز۔ کپور مارکٹ اسٹریٹ لکھنؤ ۳

بار اول : دسمبر ۱۹۷۷ء

طباعت : نائی پریس - لکھنؤ

تعداد : ایک ہزار

اشاعت : نصرت پبلشرز - لکھنؤ ۳

نشید
اور پین کی
یادوں کے نام

جُمْلہ مَقوُّوۃً بَحْتِہِ مَصَنَّفۃً مَحْفُوظًا

یہ کتاب آندھرا پردیش اور دوا کیڈمی کے مالی اشتراک سے شایع ہوئی

فہرست

۹ ...	پو پھٹنے تک
۱۶ ...	بہروپ
۲۳ ...	ننگے زخم
۳۱ ...	شرمیلہ
۴۴ ...	مورنی
۷۴ ...	شیا
۹۹ ...	ذات کے راہی
۱۲۷ ...	مسرد راستے
۱۳۹ ...	مہمان

۱۵۱	خالی پیاریوں کا مدار
۱۶۵	ہم سفر
۱۷۴	درد کا رشتہ
۱۹۸	من مول
۲۱۴	راہی اپیا
۲۲۷	کھنڈ

پو پھٹے تک

راملو کی بھوٹی سی کٹیا میں آٹھ زندگیاں سانس لیتی تھیں۔ اسی کٹیا میں انکیا کا بچپن جوانی سے جا ملا تھا۔ اسی کٹیا میں لیا کی ستیں بھگی تھیں۔ اسی کٹیا میں پوچی نے شرانا یکھا تھا۔ اور پھر اسی کٹیا میں انکیا کی بیوی نے دو بچے بھی جنم لئے۔ اور اب یہی بچے دن دن بھر کٹیا کے باہر ننگ دھڑنگ کھیلنا کرتے تھے۔ راملو نے اسی کٹیا میں خوشیاں دیکھیں، غم سہے۔

دن تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا۔ رات کو راملو اپنی بوڑھی بیوی کے ساتھ ایک کونے میں پڑتا۔ دوسرے کونے میں انکیا اور اس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ چٹے رہتے۔ تمیرے کونے میں لیا اور پوچی اپنے سر جوڑ لیتے۔ پیٹھ کے بھائی بہن ہونے کی وجہ سے لیا اور پوچی میں بہت پیار تھا۔ چوتھے کونے میں

جہاں چو لہا تھا ایک دوشی کی ہانڈیاں پڑی رہتیں جہاں آس پاس کے مرل کتے
موقع پا کر ہونچ جاتے۔

رالو کے آٹھ افراد پر مشتمل خاندان کو اس کٹیا سے کوئی شکایت نہ تھی اور اگر
شکایت تھی تو اس میں کٹیا کا کیا دوش تھا، دوشس تھا تو رالو کا اس کی بیوی کا جھپو
نے ایک نہیں دو نہیں آٹھ بچوں کو اسی کٹیا میں جنم دیا تھا۔ وہ تو اللہ کی کوئی ایسی
ہوئی کہ ہضہ پھوٹ پڑا تو ایک ہی سال میں رالو کے پانچ بچے اسی کٹیا میں مر گئے
تین بچ گئے تو رالو اور اس کی بیوی نے پیٹ کاٹ کاٹ نچوان کو پروان چڑھایا۔
اٹھیس اس قابل بنایا کہ اب وہ بھی اسی کٹیا میں بچے جن سکے۔ ہضہ کی دبانہ بھوتی
لہذا رالو کے پانچ بچے نہ مرتے تو اسی کٹیا میں آج تیرہ زندگیاں سانس لیتیں یا اس
لینے کی خواہش میں شکست رہتیں۔ رالو کا دم گھٹ جاتا۔ وہ اپنی بیوی کو ایفون
کھلا کر اور خود کھا کر سو رہتا یا بوکھلا کر کسی گھنے درخت کے سائے میں پناہ لیتا یا نہیں
معلوم اور کیا ہوتا۔ یہ بھی تو عین ممکن تھا کہ اتنے افراد اس کٹیا میں سانس لینے تو ان کی
سانسوں کی گومی سی سے اس کٹیا کو آگ لگ جاتی اور آگ نہ لگتی تو پھیرا جاتا
رالو کے جھگو ان کی کرپا تھی جو اس کے پانچ بچے ہضہ کا شکار ہو گئے اور آج رالو
اپنے خاندان کے سات افراد کے ساتھ اس کٹیا میں سانس لینے کے لیے زندہ رہ گیا۔
انکیا کی بیوی آنے والی تھی، سانس سسر تفکر تھے کہ اس کٹیا میں کس طرح
گذر بسر ہوگی لیکن انکیا کی بیوی آئی تو وہ یہ بھی نہ سوچ سکے کہ کس طرح گذر بسر کو
رہی ہے اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اسی کٹیا میں دو بچے جن دیے۔ اب رالو اور اس
کی بیوی کے بلے بیٹے اور بہو کا کٹیا میں رہن سہن کوئی مسئلہ ہی نہ رہا۔

لیکن آج رالمو اور اس کی بیوی زیادہ پریشان تھے۔ ملیا کی نٹھی منی گھر والی
بھوٹ بھاٹ کر اب جوان ہو گئی تھی۔ ملیا ان تبدیلیوں سے واقف تھا اس لیے
وہ اپنی جرد کو جلد ہی اپنے ساتھ لے آنا چاہتا تھا۔

پوچی نے اپنی ماں سے کہی بار کہا بھی تھا کہ ملیا راتوں کو سوتا نہیں بلکہ آگ
پر لوٹتا رہتا ہے، میں اس کے بستر پر آگ کی چنگاریاں ڈھونڈھتی ہوں، نوک دار
کانٹے تلاش کرتی ہوں۔ لیکن کچھ بھی تو نہیں ملتا۔ یہ چنگاریاں، یہ کانٹے ملیا کے جسم
میں اندر ہی کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ تم راحی کو بلانے کے لیے کب جا رہی ہو ماں۔؟
رالمو کی بیوی ٹکڑ ٹکڑ بیٹی کو دیکھتی رہ جاتی۔ اس کو سائی دیتا جیسے پوچی کہہ
رہی ہے کہ ملیا کے ساتھ میں بھی نو آگ پر لوٹ رہی ہوں اور میرے بدن میں بھی
سوئیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ لیکن رالمو کی بیوی کے لیے فی الوقت پوچی کی کوئی اہمیت
نہ تھی۔ رالمو کو گھر لے آنا تھا تا کہ ملیا آگ پر نہ لوٹے۔ اور پھر ملیا نے ابھی اپنی بڑی
دبا رکھی تھی۔ وہ ایک بار بس یونہی کہہ دیا تھا کہ راحی کو اب لاتے ہی بنے گی۔

پچھلے روز جب وہ اس سے ملنے گیا تھا تو اس کی ساس اس کی بے اعتنائی کا
شکوہ کر رہی تھی، بے رخی پر گالیاں دے رہی تھی۔ ملیا کی ماں جانتی تھی کہ ملیا اب
زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرے گا۔ کوئی بات ہوتی تو پہلے پہل پوچی کے ذریعہ
کانوں میں ڈلوادیتا۔ شہنائی نہ ہوتی تو پھر خود ہی آندھی اور طوفان بن کر گرجنے لگا کرتا
اور اسی لیے رالمو اور اس کی بیوی آنے والی آندھی سے سہمے ہوئے تھے۔

آج بھی رالمو کی بیوی نے ٹکڑ ٹکڑ بیٹی کو دیکھا تو اس نے کہا۔

”ماں پہلے تلے سو رہیں گے ہم“

راملو کی بیوی نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ پیل تلے کتنی راتیں کھٹیں گی اور کس طرح کھٹیں گی۔ وہ چپ چاپ راملو کے پاس چلی گئی جو کٹیا کی کھچلی بارھ میں جگہ جگہ سے ہٹے ہوئے پور کوں کو ٹھیک سے جا رہا ہے۔

راملو نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے بے دلی سے اپنی بیوی سے کہا کہ چوچی کی ماں تو تو بالکل سٹھیا گئی ہے۔ بہو گھر کو آئے گی تو کیا ہم اپنی بیٹی کو بے آسرا کر دیں گے۔ پیل تلے جو ان بیٹی کو ساتھ لے کر کتنی راتیں باہر گزار سکیں گے اور پھر اب برسات بھی شروع ہونے والی ہے۔

لیکن چوچی کی ماں راملو کی ان باتوں سے مرعوب نہ ہوئی۔ وہ زیادہ تجربہ کار تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ کٹیا کے باہر رات گزار دینی پڑے یا اندر راملو کو بہر حال جتنا جلد ممکن ہو اپنے ساتھ لے آنا ہے، ورنہ ان کے پیل کرنے سے پہلے ہی راملو اس کٹیا میں آبراجے گی اور اس کے ہمراہ ملیا چھوٹی چھوٹی آنڈھیاں بھی لے آئے گا جو کٹیا کو ہلا دیں گی۔

رامی اپنے سسرال آگئی تھی۔ بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ تاڑا اور کھوڑ کے پتوں کی فراہمی کے لیے راملو اور انکیا سرگرداں تھے۔ کٹیا کے اندر نہ کھے ہوئے بوسیدہ ٹاٹ اٹھا کر کٹیا کے پھیر پر اڑھا دیے گئے تھے کہ حتی المقدور پکے سے محفوظ رہ سکیں۔ کٹیا کو وسیع کرنے یا ایک اور چھوٹی سی کٹیا بنالینے کی حسرت راملو کے دل میں بہت دنوں سے تھی لیکن بارش کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ اپنی موجودہ کٹیا ہی پر کچھ خرچ کرنے کی گنجائش اپنے میں نہ پاتا تھا تو دوسری حسرتوں کا کیا ذکر۔

اپنے میکے سے آتے وقت رامی نے آدھی بندھی پرال کی گھاس ساتھ لے لی تھی جو پوری کٹیا میں بچھا دی گئی تھی تاکہ دیک سے جہاں کپڑے اور بستر محفوظ ہو جائیں وہاں سلی ہوئی زمین کی ٹھنڈک سے کٹیا میں رہنے والے خود کو بچا رکھیں۔ رامی کو اپنے سے زیادہ اپنی ساریوں کی جنتا تھی۔ پوچی اور انکیا کی بیوی کو اس قسم کی کوئی چنتا نہ تھی کیونکہ ان کے پاس جو ساریاں تھیں وہ ان کے بدن سے چپٹی ہوئی تھیں اور اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کے سبب انھیں دیک کا ڈر رہتا۔ رامی کی بات جدا تھی۔ میکے سے وہ اپنی سسرال کو نئی نویلی آئی تھی اور اسی لیے اس کے پاس تین ساریاں بھی تھیں۔ شام کے وقت وہ سیدتی اور گڈیل کے پھول اپنے جوڑے میں سجا کر، ساری بدل کر خود کو کٹیا کی رانی محسوس کرتی اور ٹھک ٹھک کر اٹھلا اٹھلا کر وہ اپنی بقیہ دونوں ساریوں اور چولیوں کو کٹیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں لیے لیے پھرتی۔ اپنے من کے صندوق کو سو سو جتن سے ادھر ادھر رکھتی پھرتی۔ جس میں اپنی ساریوں کے علاوہ اس نے لیا کا، ایک آدھ نیم آستین کرتہ، ایک آدھ پٹھی ہوئی دھوئی، اینا نیل اور گنگھا بھی چھپا رکھا تھا۔۔۔۔۔ پوچی کو رامی کے بناؤ سنگھار سے خوشی نہ ہوتی تو غم بھی نہ ہوتا۔ لیکن انکیا کی بیوی رامی کو بناؤ سنگھار کے دیکھتی تو اپنے بچوں کو چھوٹے چھوٹے قصور پر بھی مار پیٹ کرتی۔ ویسے رامی سے کبھی نہ الجھتی۔

دن دن بھر تو راتوں اور اس کے دونوں لڑکوں کا وقت زیادہ تر باہری گزرتا۔ اس کی بیوی بھی اپنی بڑی بہو کے ساتھ کچھ نہ کچھ محنت مزدوری کے لیے باہر چلی جاتی۔ کٹیا میں اکثر پوچی اور رامی ہی رہتیں۔ پہلے پہل تو انکیا کی بیوی کو اس

پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ رامی کیوں محنت مزدوری کے لیے باہر نہیں جاتی۔ لیکن جوں جوں دن بڑھتے گئے اس نے دبے دبے احتجاج کیا اور جوں جوں دن بڑھتے گئے رامی پرانی ہوتی گئی۔ اسی کٹیا میں نئی نوپلی ہونے کے ناطے جو مراعات اس کو حاصل تھیں وہ آہستہ آہستہ اس سے چھین گئیں۔

پھر گڈیل اور سیوتی کے پھولوں نے رامی کی زلفوں کی زینت بننے سے صرف اس لیے گریز کیا کہ رامو کے خوشبودار تیل کی شیشی خالی ہو چکی تھی جس سے وہ اپنی زلفیں سنوارتی اور گڈیل اور سیوتی کے پھول اپنے پودوں سے ٹوٹ کر اس کی زلفوں تک پہنچ کر مسکراتے۔

اب رامی کو اس بات کی بھی فرصت نہ تھی کہ وہ اپنے ٹین کے صندوق کو سوسو جتن سے ادھر ادھر کٹیا میں رکھتی پھرے جس میں اس کی ساریاں محفوظ تھیں۔ رامی وہی تھی، کٹیا وہی تھی، سب کچھ وہی تھا۔ لیکن چھوٹی بہو کی حیثیت سے رامی نے اپنی ذمہ داریاں محسوس کر لی تھیں اور انکیا کی بیوی کے احتجاج پر برامانے بغیر اپنا بوجھ خود اٹھالینے کے لیے کٹیا سے باہر اپنا قدم نکال لیا تھا اوڑھتیورمیا پر بل ڈالے بغیر عملی طور پر زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔

شام ہوتے ہوتے سب کے سب تھکے ماندے اپنی کٹیا کو لوٹتے اور پھر رات ہوتے کٹیا میں گرم گرم سانسوں کی حدت سے جیسے دھیمی دھیمی سی آگ سنگنے لگتی۔

ایک رات طوفانی بارش تھی۔ سیلی ہوئی زمین، بھیگی ہوئی کچھ دیواروں

اور چھپر کے درمیان تیز تیز سانسوں کی گرمی اور حدت بھی جیسے ٹھٹھہر رہی تھی۔ بوسیدہ کبلوں اور چھپرہوں میں پلٹے ہوئے انسانی جسم ایک دوسرے میں اپنی حرارت منتقل کر کے سرد، ٹھنڈی اور سنج بستہ رات کو جھٹلانے کی ناکام کوشش میں اپنے گرم گرم جسم اور سانسوں کی حدت کے سہارے سلی ہوئی زمین پر سکڑ رہے تھے۔ اور رات آہستہ آہستہ بڑی گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔

اور جب ڈھلے ہوئے صاف شفاف، نکھرے ستھرے سورج نے اپنی گرمی، اپنی روشنی، اپنی حدت، اپنی تمازت دنیا بھر میں تقسیم کی تو بوڑھا رملو اور اس کی بیوی سسکیاں لے رہے تھے۔ کیونکہ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے رات کے اندھیروں نے صبح ہوتے ہوئے کمٹیا کی عزت اور آبرو کو چاکر جیسے تھوک ڈالا تھا۔

انکی رات ہی سے کہیں غائب تھا۔ جاتے وقت وہ بڑ بڑا رہا تھا کہ ہم بے تھوہ ہیں۔ نردوش ہیں۔ لیکن اس زندگی سے موت بھلی ہے، ملیا کے مزاج کی تندی نے غصے اور نفرت کی آگ کٹیا بھر میں لگا دی تھی۔ بھگی ہوئی کٹیا سورج کی کروڑوں میں اس طرح نہا رہی تھی جیسے اندھیرے اور اجالے سب اس کے لیے کیا ہوں۔ لیکن کنواری پوجی کو معلوم ہو چکا تھا کہ رات کو اس کی بھابھیاں بدل گئی تھیں۔۔۔۔۔ وہ رات کو جن کے ساتھ سوئی تھیں وہ ان کے اپنے شوہر نہ تھے۔

بہارِ روپے

”دشمنوں کا مزاج ٹھیک نہیں ہے۔ آرام بی بی“

”آئینہ بھی دیکھا ہے کبھی؟ چہرہ کتنا اتر گیا ہے بڑا“

”بی بی آج پھر نظر لگ رہی ہے۔ نمک کی دو کنکریاں اتار دوں تب باہر جانا“

”اس طرح کام چلنے سے رہا۔ دو لقمے کھا کر ہی کہیں آدمی زندہ رہے ہے بھلا“

”یہ اس طرح بندی کیوں لگاتی ہو۔ یہ بندیا تو غضب ڈھاتی ہے بی بی“

”تین بچوں کی ماں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کل بیاسی گئی ہو“

”لو چلتی ہوں۔ اب میاں جی آرہے ہیں“

میری بیوی اس کی سہاروی کی اور محبت کی بے پناہ قائل تھی۔ جب تک وہ بیٹھی رہتی۔ بس اسی کی باتیں کیے جاتی۔ صحت کا خیال رکھنے کے لیے قسمیں دیتی۔

ذرا سا تیز چلنے پر ٹوکتی۔ کام زیادہ کرنے سے منع کرتی۔ میری بیوی ذرا سا مضحمل اور اداس ہوتی تو یہ دوہرے تن و تو شش کی عورت اسے سو سو طرح رجھاتی اس کا دل ہلاتی۔ اس کو ہنساتی۔

آفس سے لوٹنے میں مجھے دیر ہو جاتی تو وہ میری بیوی کی تنہائی میں رفیق بن جاتی۔ دنیا بھر کے قصے لے بیٹھتی۔ پھر بات کرتے کرتے ہر بات کا رخ لمحے بھر کے لیے میری بیوی کی جانب پھیر دیتی۔ اس کے اخلاق کی اس کی مردت کی، دو نقطوں میں اس طرح تعریف کر دیتی جیسے قصد اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ کسی اندرونی جذبے نے اسے اس قسم کی بات کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”غریبوں کے لیے جو لگن تھا میرے دل میں ہے بی بی، مجھ نصیبوں جلی نے کسی میں نہیں دیکھی۔“

یہ جملہ بالکل غیر مراد طویل پر اس قصے سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی جو وہ ابھی ابھی بیان کر رہی تھی اس کی زبان سے اس طرح ادا ہو جاتا جیسے کسی خاص جذبے نے کہلوا دیا ہو۔

پھر بات کا تسلسل قائم ہو جاتا۔ اڑوس بڑوس کی باتیں ہوتیں۔

”فاطمہ اپنے بڑے سے گھر میں مجھے تو ایک بھٹکتی ہوئی روح معلوم ہوتی ہے بی بی، بالکل بے زبان گائے کی طرح ہے یہ لڑکی، تنہا تنہا، چپ چپ، درد دیا اور کو تکے جاتی ہے۔ بہت دل اچاٹ ہوا تو چہچہے پر نکل آئی اور گز بھر کا گھونگٹ کاڑھے میٹ میٹ پلکیں جھپکاتے لگی۔ ہوا سے بھومتے ہوئے درختوں کو، اسکول کی طرف بھاگتے ہوئے بچوں کو، سڑک پر دوڑتی ہوئی موٹر دوس اور سائیکلوں کو وہ سب حال

خونی آنکھوں سے صرٹ دیکھے جاتی ہے۔ جیسے ان جھاڑیوں میں، ان بچوں میں،
ان موٹروں میں کچھ فرق ہی نہیں۔“

”میں تو بس تم دونوں میاں بیوی پر پہلی نظر ہی میں ریجھ گئی بیٹیا۔ کتنی محبت،
کتنا پیارا اس طرح جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ لیکن سچ پوچھو
تو تمہارا اکال ہے بی بی۔ اپنے اوصاف سے اپنا یا سو اپنا یا۔ ایک بار جو تمہارا ہوا سو
ہو گیا عمر بھر کے لیے۔“

”یہ ایرانی لوگ دھندے میں لگتے ہیں تو دنیا کو بھول جاتے ہیں۔ فاطمہ کا شوہر
سنتی ہوں دیے نیک آدمی ہیں۔ لیکن اتنے بڑے ہوٹل کا دھندا ہے۔ سنا ہے بھر
بخرے سب الگ کر کے اب وہ تنہا لاک ہو گیا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی غریب کو۔
رات گئے بارہ بارہ ایک ایک کئے تک آتا ہے اور پڑ رہتا ہے۔ پونچھی نہیں کہ
اندھیر دن کی طرح غائب ہوا۔ وہ بھگتی رہتی ہے بے زبان روح کی طرح ایسی دلت
بھی کس کام کی بیٹیا کہ میاں بیوی کا ہے نہ بیوی میاں کی۔“

”دیکھو دیکھو اس طرح رپ بھپ کہاں چلیں، کتنی بار سمجھایا ہے کہ ایسے دنوں
میں اس طرح تیز تیز نہیں چلتے۔ خدا نہ کرے کچھ ہو ہو گیا تو خود تکلیف اٹھاؤ گی میاں
کو پریشان کر دو گی۔“

”مگر اگر بڑے پیار سے دیکھا۔ پھر کہنے لگیں۔ تمہیں مزا بھی تو ملتا ہے نامیاں
جی کو پریشان کرنے میں۔“

”اے میں چلے پی آئی ہوں بی بی۔ میرے لیے اتنی تکلیف نہ کیا کر دو۔“
”سنا بھی ہے کچھ، یہ جو پٹروس میں چوری ہوئی ہے نا۔ کس کے طفیل لٹ

گیا بسا بسا گھر میں تو کہتی ہوں کہ میاں جی کو جتنا دو کہ کچھ دن سرشام ہی آجایا کریں۔ یہ جو عزیز میاں کے گھر سے لگا بگا ایک حجرہ سا ہے نا۔ وہاں پولیس کا ایک انسپکٹر رہتا ہے۔ بس اسی کے پھوٹے بھائی کے ہیں سب کو قوت۔ پھوٹا بھائی راتوں کو چوری کرتے ہے اور بڑا بھائی دن کو پردہ پوشی۔ لوجی کو تو ال شہر خود راہزن ہو تو چل چکی حکومت نگوڑی۔“

”اے ہے۔ میں کہتی ہوں۔ لو پسینہ خشک کر لو۔“

”میری سنو تو ذرا کمر سیدھی کر لو۔ میں پیر داب دوں۔ میری بچی جیسی تو ہو ہی۔“

”لو میں چلی میاں آ رہے ہیں۔“

اور وہ چلی جاتی۔

پھر آہستہ آہستہ تکلفات ختم ہوتے۔ میاں جی آ رہے ہوں۔ تب بھی بیٹھی رہیں۔ دو ایک بائیں اب وہ مجھ سے کبھی کرنے لگیں۔ لیکن بیوی کی بات کچھ اور تھی۔ مجھ سے ان کی صاحب سلامت ہی تک رہی۔ اور پھر اکثر یہی ہوتا۔ ”لو میں چلی سیاں جی آ رہے ہیں۔“

میری بیوی کے ساتھ بڑی ماں کا پیار محبت۔ اپنے دل میں بڑی ماں کے لیے جگہ بنانے لگا۔ ”بی بی“ کا تو یہ عالم تھا کہ بعض وقت ایسے میں یہ تذکرہ نہ بھیتیں کہ مجھے قطعی ناگوار گزرتا۔

بات ہو رہی ہے کہ بھٹی گرین اسٹور کے سیٹھ نے بیویوں کے لیے یاد دہانی کی ہے۔ وہ ملاخوار استے میں۔ جواب ملتا ہے۔ بڑی ماں آئی تھیں۔ یہ پھول میرے بالوں میں لگا گئی ہیں۔ دعائیں دیں۔ سوا لگ نمک کی کنکریاں اتاریں سو۔

لیجئے اب گرین اسٹور کے سیٹھ ملیں یا خود گرین اسٹور ہر راستے پر ملتا رہے۔
یہاں تو بڑی ماں پھول لگا گئیں اور دعائیں دیں سوا لگ۔ یہی سادی دعائیں آپ
بھی گرین اسٹور کے سیٹھ تک پہنچا آئیے۔

”چار دن سے دفتر میں اس قدر کام بڑھ گیا ہے۔ نیا سال جو۔ سن بھی رہی ہو
کچھ۔؟“

”بڑی ماں نے آج تو کمال ہی کر دیا۔“
”لیجئے۔“

اب دفتر ساتھ لے جا کر بڑی ماں سے ان کا کمال دیکھتے رہیے۔ یا فالوں کو
آگ لگا کر بڑی ماں سے کہیے کہ وہ دعاؤں کی بارش کریں۔

ایک دن میری بیوی کہنے لگی بڑی ماں آج بہت اداس تھی۔ ان کی
اپنی بیٹی اور داماد میں کچھ ان بن ہو گئی ہے۔ مجھے بھی کچھ فرصت تھی۔ میں نے بھی
بڑی ماں کی باتیں سن لینے میں مضائقہ نہ سمجھا۔ ویسے میں خود بھی تو ان کا مخالف نہ تھا۔
میری بیوی کا وہ اتنا خیال رکھتی تھیں تو میں بھی انھیں کچھ پسند ہی کرنے لگا تھا
مجھے اپنی بیوی سے شکایت تھی تو صرف اتنی ہی کہ بعض وقت وہ بے موقع بڑی ماں
کی باتیں لے بیٹھتیں۔

پھر ایک دن مجھے اپنی بیوی سے معلوم ہوا کہ بڑی ماں کی دختر نیک اختر بھی
آئی ہوئی ہیں۔ پھر وہ بڑی ماں کے ساتھ اکثر میرے گھر آنے لگیں۔ میری بیوی کو
انھوں نے بھی اپنی ماں کی طرح رجھایا اور اپنایا۔

ایک روز میں گھر پر تنہا تھا۔ ہماری زندگی میں ایک اور پھول کھلنے والا تھا۔

ایک اور زندگی کا اضافہ ہونے والا تھا۔ بیوی کو آج ہی میں نے ہاسپٹل میں داخل کرایا تھا۔

بڑی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ بڑے اطمینان سے میرے گھر چلی آئیں، پھر میرے کمرے کی طرف بڑھیں میں نیم دراز سا اپنے پلنگ پر پڑا ہوا کچھ اپنی بیوی اور آنے والے نئے جہان ہی سے متعلق سوچ رہا تھا۔

بڑی ماں کہنے لگیں "میاں جی اکیلے کیا کر رہے ہو۔ بیٹیا نہیں ہے تو دل کہاں لگ رہا ہو گا تمہارا۔ میں نے سوچا جیلہ ہی کو تنہا رہے پاس چھوڑ آؤں۔ ہم عمر ہو۔ ادھر ادھر کی باتیں کر دو تو دل بہل جائے گا۔" پھر کہنے لگیں "ہاں میاں بیٹیا کو ملنے کو بہت چاہے ہے جی! بھلا اوقات کیا ہیں ہسپتال کے۔ میں مل آؤں ذرا کی ذرا!"

جیلہ کھڑی مسکرا مسکرا کر مجھ پر کامل کو مل سی کر نہیں پھینک رہی تھی۔ ان کر نوں کے تلنے بانے سے میں ابھی بچ ہی رہا تھا کہ بڑی ماں نے آخری

پانسہ پھینکا۔

"تجھٹی میں تو چلی۔ اب تم جوانوں میں مجھ بڑھیا کا کیا کام؟" میرا دماغ ماؤں سا ہو گیا۔ میرے کان بجھنے لگے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری بیوی کہہ رہی ہے۔ بڑی ماں بہت اچھی ہیں۔ بڑی محبت سے مجھے زہر پلایا اور پھر زہر بھی کچھ اتنا تلخ نہیں تھا۔ بڑا میٹھا میٹھا سا۔ ایسا کہ آدمی چکیاں لیتا رہے اور زندگی سے دور ہوتا رہے۔ میں کچھ دیر نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر بے تحاشا بڑی ماں کے پیچھے بھاگا۔ بڑی ماں سینے تو "لیکن وہ ہماری کالونی کے گیٹ تک پہنچ

گئی تھیں۔ اور کسی سے اشاروں میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ کوئی شخص تھوڑے پر گیت کے پیچھے خود کو بچھا رہا تھا۔ شاید وہ ہمارے پڑوسی پولیس انسپکٹر کا وہی بھائی تھا جس کے متعلق شہرت تھی کہ اٹووس پڑوس میں ہاتھ کی صفائی بتاتا پھرتا ہے۔ میں لوٹنے لگا تو جمیل بچھے پر کھڑے ہوئے ایرانی سیٹھ پر مسکراہٹوں کی گزریں پھینک رہی تھی۔ وہ بھی اشاروں ہی اشاروں میں بوس و کنار کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ ایرانی سیٹھ کی بیوی فاطمہ اپنے لمبے سے گھونگٹ میں دنیا بھر کی شرم و حیا سیٹھے پہچے پر نکل آئی۔ تو ایرانی نے جمیل کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ فاطمہ تو بقول بڑی ماں کے ہوا سے پھوٹتے ہوئے درختوں کو، اسکول کی طرف بھاگتے ہوئے بچوں کو سڑک پر دوڑتی ہوئی موٹر اور سائیکلوں کو خالی خالی آنکھوں سے دیکھ جاتی ہے۔ جیسے ان بھاڑوں میں۔ ان بچوں میں۔ ان موٹروں میں کچھ فرق ہی نہیں۔ ”اے میاں پکا رہے ہو“ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بڑی ماں کھڑی تھیں۔

میں نے اپنا رخ ان کی طرف کر لیا۔ لیکن وہ ہوا سے جھومتا ہوا درخت، سڑک پر دوڑتا ہوا موٹر، اسکول کی طرف بھاگتا ہوا بچہ سبھی کچھ نظر آ رہی تھیں۔ اور میں بغیر کسی گھونگٹ کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بھری پوری دنیا میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

فنگے زخم

تہینے کی پہلی تاریخ کا تصور کسی کے لیے خوش آئند ہوتا ہو تو ہو، میرے لیے
تو سارے سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ علقہ والا۔ دودھ والا۔
مالک مکان۔ ملازم۔ دھوبی۔ بھنگی۔ نائی۔ بچوں کی فیس۔
پہلی تاریخ چپکے سے اس طرح نہیں چلی آتی جس طرح ولی دکنی کی محبوبہ دنو ازان
کے گھر آتی تھی ہے

ولی اس گورکانِ وفا کا واہ کیا کہنا
مرے گھر اس طرح آوے ہر جوں سینے میں اڑائے
پہلی تاریخ تو اپنے جلو میں بڑی ہنگامہ آرائیاں، بڑی حشر سامانیاں لیے بالکل
مخدوم محی الدین کی مرضی کے مطابق کچھ اس طرح آتی ہے

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

لیکن آنے والی پہلی تاریخ تو خاص طور پر میرے لیے مصائب کا ایک پہاڑ
لے کر کھڑی تھی۔ اس پہاڑ کی چڑھائی ہلاری اور تین سنگھ کے کارناموں سے کسی طرح
کم نہ تھی۔ جھنوں نے ایورسٹ کو فتح کر لیا تھا۔

ایورسٹ کے فاتح تو زندگی میں ایک بار ایورسٹ کو زیر کر کے امر ہو گئے۔ یہاں
یہ عالم تھا کہ جسم دجاں کی ساری قوتیں اور دل و دماغ کی ساری توانائیاں صرف
کبر کے اگر میں آنے والے جینے پر فتح پالیتا تو بھی کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ میری طرح کتنے
ہی ایسے فاتح ہوں گے جو ایک ایورسٹ پر چڑھ کر دوسرے ایورسٹ کا بڑھ چپکے
سے اپنے سینے پر رکھ لیتے ہیں۔ لیکن تاریخ کے جن صفحات میں ان کے نام محفوظ ہیں،
ان صفحات کو عرف عام میں دفتر کے رجسٹریا قبر کے کھتے کہا جاتا ہے جنہیں کوئی تاریخ
کا طالب علم دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ صفحات اس کے نصاب
کی کتابوں سے خارج کر دیے گئے ہیں یا پھر شامل ہی نہیں کیے گئے۔

میں اسی پہاڑ کی بلندیوں تک پہنچنے کی انتہاک کوشش میں یخ بستہ ماحول
کے درمیان کھڑا نپ رہا تھا کہ مجھے ایک ہلاری مل گیا میرے اس ہلاری کا نام تھا
جین۔ ر۔

جیتہ میرے آفس کے ساتھیوں میں سب سے کم عمر تھا اس کی شادی نہیں ہوئی
تھی لیکن وہ عمر کی اس منزل پر تھا جہاں عورت اپنے حسن اور عنائی سے قطع نظر کے
بھی صرف عورت ہونے کے ناتے خیال و خواب کا ایک بہان بن جاتی ہے۔ ایک

کائنات بن جاتی ہے۔ اور عقیدہ اسی کائنات میں بسا ہوا نہیں رہتا۔ کسی بھی عورت کی اس تازگی کو اپنے میں حل کر لینا چاہتا تھا جو اس کی سن سے کموار پن کے پھیلائے ہوئے زہر کو بخوڑ سکے۔

عورت تک پہنچنے میں اس کے راستے کی روکاوٹ وہ پہاڑ تھے جو پہاڑ میری اپنی بیوی اور میرے اپنے بچوں کے درمیان حائل ہو گئے تھے کسی بھی عورت کی پہلی تاریخ اس کے لیے بھی کبھی مسوفا ت، لے کر نہ آتی تھی جو سناٹا میرا پناہ مقرر بن گئے تھے۔

اس کی محرومی سچ بوجھتے تو اس کی بیمار بہن تھی جو عمر میں سب سے بڑی تھی۔ لیکن اس کے باوجود عقیدہ کی بیوہ اس اپنی اکھوتی بیٹی کی سیج و سناٹا کی تھی جو کچی کلیوں اور اڑھ کھلے پھولوں سے کسی بھی پھول والے کے پاس نہ جاسکتی تھی۔ لیکن عقیدہ کی بہن اس اسلج کے لائق اس لیے نہ تھی کہ اس کا بیاہر جبر بیوہ کی زندگی نو مشبوہ کا تحمل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی ساقوں سے دنیا بھر کی دلوں کی بواقی تھی اور اسی سے بچنے کے لیے عقیدہ نے اپنے خیالوں کی دنیا کو عورت کے تین درجین تصور سے معطر کر رکھا تھا۔ ویسے بقول اس کے وہ منقول گھرانے کا ایسا پشتہ چراغ تھا جس کی بالی گھی میں ڈبو کر جلائی گئی تھی۔

اس کی ہمدردیوں نے جب زخموں پر قلیوں کے پھاہے مرہم میں بھگو بھگو کر رکھے تو میں نے بڑی فراخ دلی اور بلند حوصلگی کے ساتھ اپنا سینہ کھول کر سارے کے سارے جگمگاتے زخم اس کے سامنے پھیلا دیے۔

اس وقت میرے زخموں کی ساری جگمگاہٹ اس کی آنکھوں میں گر کر کن

بن کر ڈھنسی رہی۔ اس کی آنکھوں میں کھسی بنی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اس کے چہرے پر دور دور تک کھسی غم کی پرچھائیں نہ تھیں اس کی آنکھوں میں کرمیں ناچ رہی تھیں اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

مجھے سخت ذہنی اذیت پہنچی تھی میرے ہرے ہرے ننگے زخموں کو اپنی آنکھوں میں کڑوں کی طرح ناجستہ ہوئی سویلوں سے اس نے پھید کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے کی دمک تمازت اور گرمی پہنچانے کے بجائے میرے زخموں پر برف کی قاشیں رکھ رہی تھی۔

آخوند میری زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی مجبوریوں ان ننھے ننھے سانحوں کی داستان سن کر آنا خوش کیوں ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے بہت جلد اپنی خوشی پر تباہ پایا۔ پھر بھی اس کی آنکھیں اس کا چہرہ کسی ڈھکی چھپی مسرت کی غمازی کر رہا تھا۔

”تم بالکل فکر نہ کرو“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کرنے ہی سے تو فکر دور نہیں ہو جاتی“ میں نے اس طرح کہا جیسے میں نہیں بول رہا ہوں۔ میرے زخموں کو زبان مل گئی ہے۔

”بس کل صبح چلے آنا میرے گھر۔ ساہم سے دلا دوں گا۔ سو دھبی زیادہ نہ ہو گا“

”تم سائنڈ کی طرح پڑے سوتے رہو گے۔ تمہیں دنیا کے دکھ درد کا علم ہی کیا ہے“ میں نے بات بگٹی کونے کے لیے اضافہ کیا۔

”میں بہت جلد بیدار ہو جاتا ہوں“ اس نے پھر اپنی خوشی کو دبانے کی کوشش کی۔

”بہت خوش نظر آتے ہیں۔ میں پوچھ ہی بیٹھا۔
 ”پھر کیا خوش نہیں ہوں گا۔ تم جیسے دوست کے کام آسکوں تو یہ مری خوش
 نصیبی نہیں ہے؟“
 ”اچھا تو یہ بات ہے۔“ واقعی اس کے اس جذبے نے مجھے بے اندازہ تسکین
 دی۔“

”ہاں ذرا کیڑے بڑھیا بہن کو آنا۔ وہ سوٹ ہے نا مٹھارا ادھی ڈاٹ لینا۔“
 ”بھئی سوٹ ہی پہن لوں گا۔ لیکن اس طرح بنا سنوار کر کہاں لے جاؤ گے
 مجھے۔“

”اسی سا ہو کے بچے کے پاس۔ اس پر رعب جو جانا ہے!“
 مجھے ہنسی آگئی۔ وہ خود بھی ہنستا رہا۔
 میں نے کہا یاں ”ایسے کتنے ہی بھوٹے رعب جانے والے اس کے پاس
 دن میں چکر لگا جاتے ہوں گے۔“
 ”کچھ بھی ہو پیارے۔ خوش پوشی ہمیشہ آنکھوں میں دھول بھونکتی ہے۔
 لوگ آنکھیں ملتے جاتے ہیں اور دھوکہ کھا جاتے ہیں۔“
 ”اچھا بھئی یہی سہی۔“

میں اطمینان سے گھر لوٹا۔ تنہا رہنے واقعی دوستی کا سختی ادا کیا تھا۔ ورنہ
 نفسی نفسی کے اس زمانہ میں کون کسی کے دل تک پہنچتا ہے۔ ایورسٹ کی فتح اب
 میرے لیے کوئی کارنامہ نہیں رہی تھی۔ کل صبح ہونے تک میں ایورسٹ کی چوٹی کو
 اپنے کھنپا کے لمس سے آشنا کر دوں گا۔ دنیا بھر کی زبان پر میرا نام ہو گا کہ نہیں

اس سے مجھے دلچسپی نہیں۔ میری بیوی اور میرے بچوں کی زبان پر میرا اسی کلمہ ہوگا۔ صبح ہوتے ہوتے میں دھڑکتے دل سے جتیدر کے دروازے پر دقت سے کچھ پہلے ہی کھڑا تھا۔ کوڑا کھٹکھٹاے تو ایک بڑھیلے دروازہ کھول کر میرا سواگت کیا۔ مجھے بڑے ادب سے لے جا کر ڈرائنگ روم میں صوفے پر بٹھایا اور خود اطلاع دینے چلی گئی۔

میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا بیٹھا جتیدر کے تنوں کے متعلق سوچتا رہا اسکے جملے رہ رہ کر میرے کانوں میں گونجتے رہے کہ یاں میرے ہزاروں روپے جو مجھے ترکے میں ملے ہیں۔ بنک میں پڑے ہیں لیکن میں اپنی ماں سے اجازت لیے بغیر ایک پیسہ بھی نکال نہیں سکتا۔ دنیا ملتی ہے یاں۔ ماں کہاں ملتی ہے ماں کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت ہے۔“

جتیدر کتنا ہمدرد دوست، کتنا فرماں بردار بیٹا اور کتنا ذمہ دار بھائی تھا۔ اس کی شخصیت کی تہہ داری آہستہ آہستہ مجھے متاثر کرنے لگی۔ میں انہی خیالات میں غطایاں تھا کہ یکایک ایک دیدہ روادار با وضع بزرگ کمرے میں داخل ہوئے میں تعظیم کو اٹھ کھڑا ہوا۔ جب انھیں میں نے بتایا کہ میں جتیدر کے لیے آیا ہوں تو وہ کچھ اس نگاہ سے مجھے دیکھ کر لوٹ گئے جیسے میں نے کوئی قصور کیا ہے۔

جتیدر آیا تو میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ یہ بزرگ کون ہیں۔ جتیدر نے بتایا کہ وہ اس کے دور کے رشتوں کے چچا ہوتے ہیں۔

بات آئی گئی ہو گئی اور ہم دونوں ایورسٹ کی فتح کے لیے روانہ ہو گئے۔ ساہو کے گھر کے قریب پہنچے تو جتیدر نے پوچھا: ”مہتیں صرف سو روپے چاہیے نا“

میں نے کہا "ہاں!" میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔

جتیئر کچھ خاموش سا میرے ساتھ جلتا رہا۔ میں نے خاموشی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ وہ مجھے سا ہو کار سے اپنے افسر کی حیثیت سے ملائے گا اور میں بھی اپنی عہدہ کو ملحوظ رکھوں۔

مجھے سنسی آگئی۔ میں نے جتیئر کو بھی ہنسانے کے لیے وہ سارے جملے اس کے آگے دہرائے جو ہم اپنے افسروں کی نقل اتارنے کے لیے اپنے ساتھیوں میں دہراتے تھے اور جتیئر اس قدر محظوظ ہوتا تھا کہ اس کی سنسی ہتھوں کی حدوں کو چھو لیتی تھی۔

لیکن اس وقت وہ بدقت تمام مسکرا سکا۔

سبا ہو کی سیٹریاں پڑھتے وقت اس نے مجھ سے کہا۔

"یار تم دو سو کا کاغذ کھ دو نا۔ سو روپے کی مجھے بھی ضرورت ہے اپنے حصہ کا سود میں ادا کروں گا۔ دفتر میں پہلی بار میرے زخموں کے عریاں ہو جانے پر جتیئر کی سترت کا عالم میری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو کر رہ گیا تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اور جتیئر جس پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں وہ ایورسٹ سے کئی ہزار فٹ بلند ہے اور ہلاری اور تین سنگھ ہزاروں فٹ نیچے کسی گہری اور عمیق کھائی میں کھڑے چلا رہے ہیں۔ تم اور جتیئر عظیم ہو۔ تم اور جتیئر امرو ہو۔ اور اس کھائی کا نام ایورسٹ ہے۔

قرض لے کر میں اور جتیئر روٹ رہے تھے تو میں اخلاقاً اس کو پھوڑنے کے لیے رکشا براس کے ہمراہ اس کے گھر گیا۔

دروازے پر پہنچا تو ان اجنبی بزرگ کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی جن سے ڈرائنگ روم میں صبح بڑھیر ہو گئی تھی۔
 وہ کہہ رہے تھے۔ "اب تو تیرا لٹڈ ابھی میرے ڈرائنگ روم میں اپنے دوستوں سے ملنے لگا ہے۔"

اور وہی بڑھیا سامنے کھڑی تھی جس نے صبح کو میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔
 میں آپ کو کس طرح بتا دوں کہ وہ ختیدار کی ماں تھی جبکہ ختیدار نے مجھے یہ نہیں بتایا۔

شرمِیلا

بیوی بناؤں گا تو اسی کو در نہ پھر عمر بھر کنوا رہی رہوں گا۔
 ایسی کوئی بات واجد میاں نے اپنے ماں باپ سے نہیں کہی۔ بس شرمائے
 جاتے اور کسی کو چاہے جاتے۔ بتی جلتی ہے تو اطراف میں اجالے بھی پھینکتی ہے لیکن
 واجد میاں جس کے لیے جل رہے تھے اس کے سچے میں بھی روشنی کی ایک کرن تک
 نہ آئی تھی جو وہ اپنا راستہ پاسکتی۔ وہ بے چاری بھی گھوڑا اندھیروں میں بھگتی رہ گئی
 جہاں ذرا سی جگنو کی چمک نظر آئی اور دُوری پیچھے۔ ایسے میں بھلا کیا ہاتھ لگ سکتا تھا
 اور اگر جگنو ہی ہاتھ لگ جاتا تو وہ بھی ایسا کیا ہو جاتا۔ یہی تا کہ وہ چمک بھی مٹ جاتی۔
 جو اندھیروں کا احساس بڑھا دیتی ہے۔

اب طاہرہ کے لیے واجد میاں سناٹے میں پٹنا ہوا تاشہ نہ رہے تھے اب

تو صرف سناٹے رہ گئے تھے۔ اور بس۔۔۔ خاندان بھر میں باتیں ہوتیں۔ گھر گھر
میں چرچا ہوا۔ جس کسی نے سنا واجد میاں کی تعریف کی۔ بھوری بیگم کی قسمت کو ملرا۔
”انھیں تو آنکھ بند کر کے اپنی لاڈلی کا ہاتھ واجد میاں کے ہاتھ میں تھما دینا چاہیے۔ کون کسے
جرے ہیں۔ طاہرہ میں۔ پھر لڑکا بھی واجد میاں جیسا کماؤ فوت جو دریا کے سینے سے
سیپ نکال لائے اور سیپ کے سینے سے ہوتی۔“

اور جب تک واجد میاں دامادی کی امید میں بھوری بیگم کے گھر کا طوائف
کرتے رہے۔

بھوری بیگم کے دن اچھے ہی گزرے، اچھا کھاتیں، اچھا پہنتیں اور طاہرہ
کو تو جیسے کسی چیز کی کمی ہی نہ تھی۔

دیسے بھی بھوری بیگم مزاج کی بڑی نرم تھیں۔ واجد میاں پسند نہ بھی ہتے
تو طاہرہ کی خاطر وہ سب کچھ سہہ لیتیں، لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ واجد میاں
نہ صرف بھوری بیگم کو پسند تھے۔ بلکہ سارے خاندان کے ایک ایک فرد نے ان کی
طرفداری میں اپنا اوٹ دے دیا تھا۔ اور بات بالکل طے تھی کہ بھوری کو بڑا اچھا
داماد مل رہا ہے جو پیچتر کا کلیجہ چیر کر نعل نکال لاتا ہے اور اسی نعل کی روشنی سے
بھوری کا گھر منور ہے۔

واجد میاں یوں بھی بھوری بیگم کے لیے غیر تو تھے نہیں۔ انھیں کے دیور کے
لڑکے تھے۔ اور شہر بھر میں بھوری بیگم کے دیور کا کاروبار بڑے ٹھٹھے سے چل رہا
تھا۔ بس کھڑے کھڑے ہزاروں کی کوٹھیاں، مکانات، باغات، زمینیں نیلام کروا
دیتے تھے۔ کمیشن ملتا سو الگ، ساز باز ہوتی سو جدا۔ دولت بھوری سو الگ، نام

کمیا یا سوجدا۔ اور ایسے دیور کے واجد میاں اکھوتے بیٹے تھے۔ اس طرح یہ گھر بھی واجد میاں ہی کا گھر تھا۔ لیکن بات دراصل یہ تھی کہ دونوں گھروں کے آپس میں تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ خون کا رشتہ عدالت کی دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوتا ہوتا ہو، دل کی نگرانی میں تو میں پیار کا جادو چلتا ہے۔ بھائی بھائی سے ملتا تھا، لیکن واجد میاں اپنی بہت علم سے بر ملا تھے۔ اب ان کے پاس تو دونوں نعمتیں تھیں۔ خون کا رشتہ بھی پیار کا جادو بھی۔ لیکن ان کی ماں اس پیار کی اہلیاتی کھیتی پر ٹڈی دل کی طرح کسی وقت بھی لیغا کر سکتی تھی۔ اور یہی دوسرے واجد میاں کی سکڑا ہٹوں پر پہرے بٹھائے رکھتا۔

یہی خوف بھوری بیگم کو بھی کھنکھن کر ہنسنے سے روکتا رہتا۔ لیکن خاندان کی وہ عورتیں جنہیں واجد میاں کی خوشنودی منظور ہوتی آپکھ اس قسم کی باتیں کرتیں۔

”ادنیٰ دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی؟“

وہ عورتیں جنہیں بھوری بیگم سے قرب خاطر تھا انہیں بھی تسلی دیتیں۔

”ہاں بہن بڑا نیک لڑکا ہے؟“

”لیکن ماں کے آگے لب سل جاتے ہیں اس کے“۔ بھوری بیگم انہیں دکھ سے کہتیں جیسے اس کی نیکی کا ماتم کر رہی ہوں اور بعض اوقات واقعی ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

”چلو جی تم تو کمال کرتی ہو بھوری۔ واجد بچہ تو ہے نہیں جو اپنا برا بھلا

نہ سمجھتا ہو۔ غلام حد سے سوا ہوتا ہے تو مرنا کیا نہیں کرتا؟“

”ماں، ماں نہ ہوگی تو اولاد، اولاد کیوں ہونے چلی۔۔۔ بھوری بگیم کی ہمدرد عورتیں تسلیاں دیتیں۔“

داجد میاں اپنی چچی کے گھر دتھو میاں پکارے جانے لگے۔ سبھوں نے انھیں اپنا یا اور ان کی منزلت کی۔ خود دتھو میاں میں چاہے جانے کے بڑے ڈھنگ تھے۔ ٹانڈاں بھر کو اپنا لینے کا ایک ایسا طریقہ انھوں نے ایجاد کیا تھا جو آج تک ان کے اجداد میں کسی کے بس کا روگ نہ ہوا۔ واقعی دتھو میاں کا اعجاز تھا۔ عقلیں حیراں رہ جاتی تھیں۔ زبانیں گنگ، لوگ ٹکڑ ٹکڑ نہ کیجے رہ جاتے اور داجد میاں پھولے نہ سماتے۔

”بھئی ایف۔ ڈی خان کے پاس سے ہم نے کنٹرول ریٹ پر دو روپے پونے چھ آنے گز سے یہ کپڑا خریدا تھا۔“

”دو جو بھائی کن دامنوں لے آئے امی؟“

”ایک روپیہ چار آنے سے لے آیا ہے بیٹا۔ صرف ایک روپیہ چار آنے گز۔“

”آدھے کو آدھا فرق امی!!“

”ہاں بیٹا! — بلا کا ہوشیار ہے یہ لڑکا۔ مٹی سے سونا اگائے گا۔“

”اشر دتھو بھائی آپ کتنے اچھے سے ہیں۔ طاہرہ آپا تو بس ٹھانڈ کریں گی امی!“

اور داجد میاں اپنی تعریف و توصیف سن سن کر لاجبختی کی طرح بجاتے رہتے انکار می سے اس راز کا اقرار کر دیتے کہ انھیں اتنے کم دامنوں پر کپڑا کس طرح دستیاب ہو جاتا ہے۔

خالہ امی "بات دراصل یہ ہے کہ کپڑے کا جو سب سے بڑا تھوک بیوپاری ہے
 ناسوہن لال اس سے میری زمانے سے ملاقات ہے بلکہ آپ دوستی سمجھئے۔ بلکہ
 ۔ بلکہ اب میں آپ سے کیا چھپاؤں بے چارہ معمول سا آدمی ہے۔ اپنی کمپنی سے
 ابا کو کہہ کر میں نے اس کو قرض دلوا یا۔ بس اسی رقم سے اس نے کپڑوں کا دھنڈہ
 شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے آج شہر کا بڑا بیوپاری بن بیٹھا ہے۔ مجھے وہ سال
 کپڑا مل کے بھاؤ سے دیتا ہے۔ ایک پیسہ بھی منافع نہیں لیتا۔"

"تم سے بھلا کیسے منافع لے گا میاں۔ تمہاری جوتیوں ہی کا طفیل ہے جو
 آج وہ سیٹھ بن بیٹھا ہے۔ خالہ بھی واجد میاں کی تعریفوں کے پل بانڈھتیں اور
 بھوری بیگم بھولی نہ ساتیں۔"

پھر خاندان بھر میں واجد میاں کے اس کارنامے نے پلک جھپکنے تک وہ
 شہرت پائی کہ کیا صاحبزادے گگن اور کیا میاں ٹیٹون نے دنیا بھر میں پانی
 ہوگی۔

بھوری بیگم کے ہر چاہنے والے نے واجد میاں کو زحمت دی۔ اور واجد
 میاں خوشی خوشی ہر قسم کا کپڑا بازار کے آدھے داموں مل کے ریٹ سے خاندان
 بھر کے لیے فراہم کرتے رہے۔ عمدہ سے عمدہ ساریاں کم سے کم داموں دلائیں۔ اچھی
 سے اچھی شرمنگ ادنیٰ پونے دلا دی۔ وہ تو خریدار کی قوت خرید ہی نے جواب دے
 دی۔ اب بھلا لوگ کھانا پیاسا بچہ چھوڑ کر صرف کپڑا ہی خریدنے سے نور ہے۔
 جس سے جتنا ہو سکا اس سے بڑھ چڑھ کر اس نے لیا اور واجد میاں خدمت چلتی
 نہیں خدمت خویش و اقارب سے خوش ہوتے رہے۔

واقعی واجد میاں کو اس کام میں ملکہ تھا۔ آئے دن مختلف قسم کے یو پاروں سے ملنا جلنا، اٹھنا، بیٹھنا، پھر مال کے ایسے پارہ کھ کر کبھی نہ چوکتے۔ مذنگ کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت ایسی قیمت میں فراہم کر دیتے جس کا حصول کسی دوسرے کے لیے ان دانوں میں ممکن ہی نہ تھا۔

چھوٹی مانی بھی بھوری بگیم کی کچھ مخالف تھیں۔ واجد میاں کا ظاہر سے ناظر انھیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس معاشقہ کی انھوں نے بڑی تہنیت بھی کی تھی واجد میاں ان کے ہاں کر ہی جاتے تھے۔ ایک دن واجد میاں کی اتنی نے کام سے اپنے بھائی کے گھر واجد میاں کو بھیجا۔

بادل ناخواستہ سہی تعمیل حکم میں وہ چلے گئے۔ ماموں تک اسی کا پیام پہنچایا۔ نوٹس لگے تو ماموں نے چائے کے لیے رد کا۔ مانی نے اپنے نئے ٹی سیٹ کی نمائش کے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے بھی واجد میاں کی عادات میں کسی اصلاح کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن واجد میاں تو بس کسی بھی اچھی چیز کے ریا تھے۔

ٹی سیٹ انھیں پسند آیا اور انھوں نے دل کھول کر مانی سے اس کی تعریف کی۔ جب قیمت پوچھی تو مانی نے پچیس روپے بتلائی۔

واجد میاں پر تو بس کجالی ہی تو گر گئی۔ جیسے ان کے ماموں کو کسی نے ہزاروں میں ٹھگ لیا ہو۔

”کیا قیمت بتائی مانی جان آپ نے؟“ انھوں نے جیسے اپنی جگہ سے اچھل کر پوچھا۔

”بس پر پھر روپے میاں“

”سچ بہت قیمت دے دی آپ نے“
 مانی نے کچھ چپیں بجیں ہو کر کہا۔ ”تو کیا میں تم سے بھوٹ کہوں گی؟“
 واجد میاں سنبھلے۔ ”نہیں یہ بات نہیں۔ آپ نے کسی ملازم سے تو نہیں منگوا؟“
 ”نہیں بھئی میں خود آج ہی لے آیا ہوں۔“ ماموں بیچ میں بول اٹھے۔
 ”آج ہی خریدا ہے آپ نے؟“ واجد میاں نے مزید تصدیق چاہی۔
 ”آج ہی نہیں بلکہ ابھی ابھی لائے ہیں یہ“ مانی نے تصدیق کی۔
 ”تو پھر فوری واپس کر دیجئے۔“ واجد میاں نے اصرار کیا۔
 ”آخر کیوں بھئی“ ماموں نے کچھ بے کھل ہو کر پوچھا۔
 ”میں یہی ٹی سیٹ صرف سترہ روپے میں آج ہی لادوں گا۔“ واجد میاں بولے۔
 ”سچ“

”جی ہاں بھلا آپ سے بھوٹ کہہ سکتا ہوں۔“
 ”میں کہتی ہوں نا۔ مہتیس ڈھنگ سے کوئی چیز خریدونی ہی نہیں آتی۔ ٹھگ
 لیا بے ایمان نے مہتیس۔ پورے نو روپے زیادہ یلے پا جی نے۔ جاؤ کھلی اب
 لوٹا آؤ جلدی سے۔“ مانی نے ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں اپنے شوہر سے
 مخاطب ہو کر کہہ دیں۔

ماموں نے ٹی سیٹ ڈبے میں پکی کر لیا۔ تو واجد میاں کہنے لگے۔ چلیے
 میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔ آپ سے پیسے وہیں لے لوں گا اور آج رات بالکل ہی
 ٹی سیٹ خدمت میں پہنچا دوں گا۔ میں ابھی آپ کو لاؤتا لیکن جس دوکان سے تجھے
 لینا ہے وہ بہت دور ہے اور مجھے دوسرے کام بھی ہیں اس وقت۔

ماموں نے ٹی سیٹ واپس کر کے واجد میاں کو سترہ روپے دے دیے اور فوراً روپے گھر آکر بیوی کے ہاتھ میں رکھے تو وہ خوش ہو گئیں۔ کہنے لگیں واجد بڑا سمجھدار اور پیارا لڑکا ہے۔ بڑا کاروباری۔ بڑا لال چلی۔

میں اپنی منہ سے کہوں گی طاہرہ کو بھٹ پٹ اپنی بیٹی بنالیں۔
 اور سنبھلی کے سوچے آن ہوئے ہی تھے کہ واجد میاں مسکراتے ہوئے پہنچے۔
 بالکل وہی ٹی سیٹ۔ ساتھ میں سترہ روپے کی باضابطہ رسید۔
 ماما نے گلے لگا کر پیشانی چوم لی۔ میں اب میاں جو بھی خریدوں گی تمہارے
 مشورے سے خریدوں گی۔ یہ تمہارے ماموں تو بس گھر کا دیوار ہی نکال دیں گے۔
 اور واجد میاں بیٹھے لجاتے اور مسکراتے رہے۔

لوگ کہتے ہیں شرم وحیا لڑکیوں کا زیور ہے۔ لیکن واجد میاں نے بڑی
 چاؤ سے یہی زیور خود پہن رکھا تھا۔ شرم ان کا مزاج تھی تو حیا ان کی فطرت اب
 شرم وحیا کے ان پردوں سے باہر نکل کر طاہرہ تک ایک جست میں پہنچ جانا ان
 کی فطرت کے مفاد تھا۔ ان کے مزاج کے مٹانی۔

لیکن محبت بھی کوئی ایسا درخت تو ہے نہیں جو کسی بنجر زمین میں لی و دق صحرا
 میں آپی آپ پھلتا پھولتا رہے۔ اور ادھر اس نیسے سے پودے کی آیا ہوئی کرنے والے
 ہاتھ خود اگر اتنے نازک نازک ہوں کہ ہوا کا ہر سروگرم جھونکا ان سے مس ہو کر انہیں
 چھوئی موئی کی طرح مر جھادے تو محبت کا بدوان چڑھنا ہو موم۔ آغوش ہو ابھی سی۔
 طاہرہ کی سہیلیوں نے خود اپنے کانوں سے سنا کہ طاہرہ سلیکین بھائی سے کہہ
 رہی تھی۔ اللہ واجد بھائی کا نام لے کر آپ مجھے کیوں پھیرتے ہیں۔ وہ تو میرے

سگے بھائی ہیں۔ سگ۔ گے بھائی۔

اور مسکین بھائی کے چہرے پر کلیاں سی کھل گئی تھیں۔

مسکین بھائی چار پانچ محبتوں کی ابھی بری یادیں زادِ سفر کے طور پر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس فن انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ تجربہ کار کھلاڑی تھے۔ طاہرہ جیسی لڑکی جو ہرجگوئی کی چمک کو اجالوں کا پیام سمجھ بیٹھتی تھی۔ مسکین میاں کی سرچ لائٹ میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ آنکھیں ایسی خیرہ ہوئیں جیسے ٹی پر لگی ہو۔

اللہ و جو بھیا تو میرے سگ گے بھائی ہیں۔

”اللہ و اجد بھیا تو میرا سگ گا۔ سگ گا بھائی ہے۔“

ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ داجد میاں کو طاہرہ کے پاس بیٹھا ہوا دیکھ کر مسکین میاں نے آتے کے آتے طاہرہ کو چھیڑا۔ مبارک مبارک۔

”ادنیٰ۔ و جو بھیا تو میرا سگ بھائی ہے۔“

”کیوں تو ہے نامیرا سگ بھائی؟“

اور داجد میاں کے پیروں کے نیچے ساری دھرتی اڈول کر رہ گئی۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا طاہرہ کو؟

پھر یہ دھرتی خاندان بھر کے قدموں کے نیچے ڈول گئی۔ کسی نے طاہرہ سے ہمدردی کی۔ کسی نے بے وفا ٹھہرایا۔

”سنئے ہو بھئی۔ بھوری بیگم کی لاڈلی کے کو قوت۔ داجد میاں کو حقیقی بھائی کہنے لگی ہے اور وہ بے چارہ ہے کہ آج تک اپنے سینے میں الاؤٹا

لگائے خاندان بھر کا کوڑا کرکٹ اسی الاؤ کے لیے چننا پھردا ہے ۔
 ”کیا کرے گی بھلا ۔ انتظار میں کوئی عمر ستانے سے تو رہا ۔ واجد میاں الاؤ
 جلائے رکھیں یا آتش نشاں سینے میں بالیں ۔ طاہرہ خود بھی تو ایک جلتی ہوئی بھٹی
 ہے ۔ الاؤ کی آج آنکھوں سے بھی تو نہیں رہتی ۔ آتش نشاں پھٹ بھی تو
 پڑتا ہے ۔ لیکن اس جلتی ہوئی بھٹی کا کیا ہو گا جس کے شعلے اپنے ہی دھوئیں میں گھپ
 جاتے ہیں ۔“

مسکین میاں نے اس بھٹی پر پیار کی آغوش کی کہ آخر شش کو نبلیں پھوٹ
 آئیں ۔

بھوری بیگم بس ٹکڑے ٹکڑے بھتی رہ گئی ۔
 مسکین میاں امڈے ہوئے بادل کی طرح چھائے ۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بو سے
 اور بادل چھٹے تو کھیتی اہلیا رہی تھی ۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ بھوری بیگم کیا
 سب کے سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ۔

خاندان بھر کے چہیتے واجد میاں، بھوری بیگم کے داماد بن سکے ۔ ان کی
 پیار کی اہلیا تو کھیتی پر واجد میاں کی ماں نے کھلے بندوں ٹڈی دل کی طرح یلغاد بھی
 نہیں کی، لیکن ان کی فطرت میں شرم و حیا کا لبادہ اوڑھ کر جو بزدلی چھپی بیٹھی تھی وہ
 بھی تو واجد میاں کی ماں ہی نے ان کے سینے میں پھیپھڑی تھی ۔ جس کا احساس واجد میاں
 کو اس وقت ہوا جب طاہرہ نے ان سے پوچھا ۔

”کیوں رہے تو بے نامیرا سا بھائی ۔“

لیکن یہ خلش بھوری بیگم کے دل میں جیسے ناگزیر ہو کر رہ گئی ۔

کیا کماؤ بیوت و اما دہاتھ سے نکل گیا تھا۔ خاندان بھر میں جس کی ہوشیاری سے زیادہ جس کے کا دہ بار کی دھوم تھی۔ میں نے ہر اس شخص کو چاہا تھا جس کو بھوری بیگم نے اپنا سمجھا۔ خاندان بھر کی ضروریات اس نے آدھی قیمتوں میں فراہم کیں جس گھر میں نکل جاتا ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ کیا خاموش شرمیلا سا۔

بھوری بیگم کانپ کر رہ جاتیں۔ اس کی ہائے نالگ بجائے کہیں طاہرہ کے بے بسائے گھر کو۔

طاہرہ کے بے بسائے گھر کو تو ہائے وائے لگی نہیں۔ ہاں واجد میاں اندر ہی اندر ایسے بیٹھنے لگے جیسے مٹی کا گھر دندا پانی پڑتے ہی ڈھلے جاسے۔

ایک دن وہ بھوری بیگم سے ملنے آئے تو طاہرہ نے اپنی نئی ساری انھیں دکھائی جو وہ پہنے ہوئے تھی۔

دو توجھتیاں۔ یہ مسکین نے میرے لیے بھیتیں روپے میں دلائی ہے۔ دو توجھتیاں ساری دیکھ ہی رہے تھے کہ چھوٹے ماموں آدھکے۔

آداب سلام کے بعد سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو واجد میاں نے ساری کا پلو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا۔ بہت تعریف کی۔ پھر آہستہ سے کہا۔ بھئی بھتیس روپے بہت دے دیے مسکین نے۔ بائیس چوبیس سے زیادہ کی نہیں ہے۔

”تو لوٹا دوں اسے۔“ طاہرہ نے پوچھا۔

”بالکل لوٹا دو بھئی۔“ واجد میاں بولے۔

”تو لادے گا نا بھیا بائیس روپے میں۔“ طاہرہ نے مزید اطمینان کرنا چاہا۔

”ہاں بھئی لا دوں گا۔“

ماموں بیچ میں بول اٹھے — ”بھئی مسکین میاں جہاں سے لائے ہیں اس
دوکان کا پتہ بتلا کر انھیں کو دے دینا۔ یہ اس ساری کو لوٹا بھی دیں گے اور ایسی
ہی دوسری لائیں دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے“ واجد میاں بولے۔

ماموں کہنے لگے — ”جو باتیں یاد ہے ناہاراٹی سیٹ لوٹا کرتے تھے فورڈ
بجائے تھے۔“ واجد میاں نے شرما کر نظریں جھکالیں۔ پھر اس طرح تڑپ کر ماموں کو دیکھا
جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکے — یہ بھی نہ کہہ سکے کہ میں اپنے
ہی گھر میں لوٹ لیا گیا ماموں لیکن مجھے نہ آپ نے بچایا نہ بھوری گچی نے۔
طاہرہ نے ساری بدل کر نئی ساری تولادی وہ ہاتھ میں لے کر اٹھے اور چھپکے
سے باہر نکل گئے۔

ماموں نے کہا ”بھوری“ دیکھا تم نے وہ اب دیدہ ہو کر بھاگا ہے یہاں
سے۔ بڑے زبان سالو کا ہے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے۔ خاندان بھر میں
چاہے جانے کی خاطر اس نے کیا کیا نہیں کیا۔“ اور ماموں نے ذرا جھک کر بھوری
کے کان میں کہا — ”یہ سب کچھ غریب نے طاہرہ کو حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔“
”ہمیں بھی سنائیے نا ماموں۔“ طاہرہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بیٹی۔ میں کہہ رہا تھا عجیب احمق سالو کا ہے۔ ایک بار
میں نے ایک فی سیٹ چھبیس روپے میں خرید لیا تھا۔ اس نے کہا بہت ہنگامی ہو
سترہ روپے میں ملتا ہے۔ بس اتنا سنا تھا کہ تمہاری ممانی گلے کا ہار ہو گئیں کہ
جاؤ لوٹاؤ فوراً۔ میں واجد میاں کے ساتھ ہی جا کر وہ فی سیٹ لوٹا آیا اور

سترہ روپے انھیں دے دیے کہ وہ ایسا ہی لادیں۔ اسی روز واجد میاں نے ٹی سیٹ ہمیں لادیا۔ یہ سیٹ انھوں نے پھر اسی قیمت میں اسی دوکان سے خرید لیا اور کئی کے پیسے جیب سے خود پورے کر دیے۔ مجھے یہ بات کچھ دن بعد اسی دوکان والے نے بتلائی کہ وہ ٹی سیٹ وہی صاحب خرید لے گئے جو لوٹاتے وقت آپ کے ساتھ تھے اور میں بس مشتہر رہ گیا۔

”ایسا کیوں کیا ماموں“ طاہرہ نے سوال کیا۔
 ”تعریف نکلتی ہے نا بھئی“ وہ کام جو کوئی نہیں کر سکتا وہ انھوں نے یوں کر دکھایا۔

”اے اللہ! طاہرہ کا مسہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔“
 ”تو اتنی انھوں نے جو کپڑے کم داموں میں“ طاہرہ، بھوری سبکیم سے مخاطب
 ہی ہوئی تھی کہ ماموں نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔

”اب یوں ہر بات کئی تہ میں جانا بھی کیا ضروری ہے؟“
 ”طاہرہ نے دل ہی دل میں سوچا، کتنے چنگے داموں ہمیں حاصل کرنے چلے تھے و جو بھیجا اور کتنے سستے داموں اپنی ہی بزدلی کے ہاتھوں مجھے بیچ دیا۔“
 پھر وہ کھکھکا کر ہنس پڑی۔ ”اللہ! جو بھیجا بے چارے۔“
 ماموں بھی ہنس پڑے اور بھوری سبکیم بھی۔

مورلتے

مجھے معلوم ہو کر نئے اسٹیشن ماسٹر نے ایک چھٹی ابا کے نام راز میں بھائی ہے۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ اس لیے بھی کہ میں تصور و ارادہ تھا، تو بے تصور بھی تو نہ تھا، مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ادھر کچھ دنوں سے تیا اسٹیشن ماسٹر ہاڑی حرکات و سکنات پر بغور نظر رکھ رہا ہے۔ اس لیے ہم نے اس کے گھر کا طواف پہلے کے مقابلہ کم بھی کر دیا تھا۔ پھر بھی پی کا کاک اکا تا تو ہم کسی نہ کسی بہانے اس کا ساتھ دینے پر مائل ہو جاتے۔

پی کا ک ہمارا بڑا پیارا دوست تھا۔ بڑا زردہ دل۔ اس کا نام تھا دیو سی سنگھ۔ موجودہ اسٹیشن ماسٹر سے پہلے جس کی چھٹی ابا کے نام آئی تھی، دیو سی سنگھ کے والد بھی اسی مقام پر دیو سی اسٹیشن ماسٹر ہی تھے۔ ان کا تبادلہ

چونکہ کہیں دور دراز ہو گیا تھا اس لیے اپنی بیوی بچوں کو فی الوقت انہوں نے یہیں چھوڑ دیا تھا اور خود ماضی طور پر اس نئے مقام پر چلے گئے تھے، جہاں ان کی تعیناتی عمل میں آئی تھی اور وہ اپنے تبادلے کے لیے کوشاں تھے۔ ویوی سنگھ کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جو یہیں ڈل اسکول میں پڑھتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ پی کاک کے ابا کا تبادلہ ہوا تو ہم بے انتہا غموں میں ہو گئے تھے اور جب گرما کی تعطیلات یہاں ودھان پور میں گزرا کر جب ہم اپنے اپنے کالج کو لوٹنے لگے تھے تو پی کاک مجھ سے چمٹ گیا تھا اور ہماری آنکھیں بھیگ گئی تھیں لیکن مجھے اس نے فوراً اسی خط سے اطلاع دی تھی کہ اس کے والد فی الوقت اس کے بھائی اور ماں کو یہیں چھوڑ رہے ہیں کیونکہ وہ نیا مقام جہاں اب ان کا تبادلہ ہوا ہے، بے حد تکلیف دہ ہے۔

اس طرح میری اور پی کاک کی دوستی ودھان پور میں ابا کی اور سابقہ اسٹین ماسٹر کی ملازمت کے سبب ہو گئی تھی۔ ایک اور صاحب بھی تھے کبھی منصف مجسٹریٹ کے صاحبزادے تھے ان کا نام تھا عجیب الدین۔ بڑے شرمیلے سے تھے۔ بالکل پھوٹی ہوئی کی طرح۔ وہ ہنسنے کو کھلتے اور ہم انھیں دیکھتے رہتے۔ تو وہ بیچارے اپنی مجال ہی بھول جاتے۔ آہستہ آہستہ جب وہ ہمارے دوست ہوئے تو پتہ چلا کہ ان کی یہ انفعالییت ان کی بیمار جنسی گھٹن کا باعث ہے جو بہت ہمت کو قوت دیتا ہے تو تصور اور اپنے لہجہ کا سہارا لے کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل تو وہ ہم سے کھلے نہیں۔ کئی دن گزر گئے تو ایک دن پی کاک نے یکایک ایک عجیب حرکت کر دی، اس نے عجیب کے ساتھ جو چہرہ اسی تھا اس کو ڈانٹا کہنے لگا کہ وہ

اسی وقت واپس چلا جائے۔ عجیب کوئی بچہ نہیں ہے، شام ہوگی تو وہ خود گھر لوٹ آئے گا۔ چیراسی نے پس و پیش سے کام لیا تو وہ اور برہم ہو گیا۔ کہنے لگا مجسٹریٹ صاحب سے کہنا کہ کلکٹر صاحب کے لڑکے نے مجھے ڈرا دھمکا کر بھگا دیا کہ میں سائے کی طرح عجیب میاں کے ساتھ نہ رہوں۔ یہ اشارہ میری طرف تھا۔ ابا کلکٹر تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ عجیب شام کو چل تدری کے لیے نکلا تو ایک چیٹر اسی اس کے پیچھے پیچھے اس کی رکھوالی کے لیے رہتا۔ خیر صاحب جب یہ چیراسی چلا گیا، تو پی کا ک نے عجیب کی باہنہ بکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچا اور اس کے سینے سے بھینچ کر اس کے گالوں پر چٹا چٹ کٹی بو سے تبت کر دیے۔

عجیب کا حال دیدنی تھا۔ گوری رنگت سرخ ہو اٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ احتجاجاً کچھ کہتا، خود پی کا ک نے اسے جھاڑ بتائی۔ کہنے لگا کہ اب کبھی وہ ملنے جلنے میں عورتوں کی طرح شرماے گا تو بھرے بازار میں اس کے پیار لے گا وہ۔ عجیب نے ایک نرم سی ہلکی پھلکی گالی دی اور اس دن سے بنے تکلف ہو گیا۔ اور واقعی ہمارے ساتھ جوں جوں اس کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ ہوا اس کی نسائیت کم ہوتی گئی۔ یہ پی کا ک کا ہی اثر تھا وہ عجیب کی تنہا کرتا رہتا۔

یہاں بات یہ ہے کہ جب اس کا نام دیوی سنگھ ہے تو میں اس کا پی کا ک کیوں کہہ رہا ہوں۔ دیوی سنگھ اپنے گھر میں دیوی ہوگا، یا دیوتا، یا سب کچھ ہوگا۔ ہمارے لیے تو وہ بس پی کا ک تھا۔ ہم دوستوں میں اس کی شخصیت بھرپور طور پر ابھرتی تھی، تو بس اسی ایک نام سے — میں آپ کو ذرا وضاحت سے ساری باتیں سنا دوں، تو خود آپ کو دیوی سنگھ، پی کا ک ہی کے نام سے بھلا لگے گا۔

کالج کا یہ کھنڈر اطالبعلم سبک وقت و متضاد چیزوں کا رسیا تھا۔ ایک کتاب اور دوسرے عورت۔ عورت کہیں رہے کسی روپ میں، کسی عمر کی وہ اس کو ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے وہ دیکھ نہیں رہا ہو بلکہ کپڑے اوچ رہا ہو۔ عورتیں بھی اس کی نظروں کے وار کو فوری محسوس کرتیں اور لجا کر سمٹ کر رہ جاتیں۔ بعض ایسی بھی ہوتیں جو سینہ تان کر ہر وار پہننے کے لیے تیار ہو جاتیں لیکن کبھی کبھی اسے ایسی عورت سے بھی سابقہ پڑ جاتا جس کے جسم پر پی کا ک کی چھتہ ہوتی نظروں کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے اس کی نظروں کی کرنیں سوئیاں بن کر آنکھوں میں دھنسل رہی ہیں۔ لیکن مورنی تو ایک ایسی عورت تھی، جو پہلی، دوسری اور تیسری شق میں کہیں بھی شامل نہ کی جاسکتی تھی۔ وہ تو ایک چلتا پھرتا ایسا جادو تھی جس کا اثر مرد پر کم خود اس کی ذات پر زیادہ ہوتا تھا۔ کوئی مرد اس کو دیکھے یا نہ دیکھے وہ خود کس مرد کو دیکھ کر پسینہ پسینہ ہو سکتی تھی۔ پی کا ک اسی مورنی سے آنکھیں لڑانے کی کوشش میں بجا ہوا تھا۔ اس کو ان باضابطہ ریاض کو نا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے بچے کی بالکنی پر سے کئی بار اس کو کھڑی دوپہر میں ہیٹ لگاے پانی کی اس ٹسکی کے نیچے پہروں کھڑا ہوا دیکھا تھا، جو مورنی کے درپے کے سامنے تھوڑے سے فاصلے پر تھی۔

نظر بازی کا یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ پی کا ک رات رات بھر چاندنی میں چمکتی ہوئی ریل کی پٹریوں پر بیٹھا مورنی کو تاکا کرتا۔ پانی کی ٹسکی کے فولادی ستون کی ادٹ سے اس نے نظارہ بازی کے ایسے زاویے بنا رکھے تھے کہ مورنی کے کمرے کی ایک ایک چیز آسانی سے نظر آ سکتی تھی اور وہ چھپ چھپ کر مورنی کو چلتا

پھرتا ہوا، بیٹھا ہوا، لیٹا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

مورنی کوئی حسین عورت نہیں تھی۔ لیکن سچل ضرور تھی، اس کو دیکھ کر گیلے باگلوں میں جے ہوئے بچوں کا خیال نہیں آتا تھا۔ بچوں سے لڑی کسی ایسی جنگلی بیل کا خیال ضرور آتا تھا جو کس کمزور درخت سے پھٹ کر رہ گئی ہو اور جس سے کوئی انسانی ہاتھ آج تک مس نہ ہوا ہو۔

مورنی سے پی کاک کی راہ درسم مذاق مذاق میں یہ صورت اختیار کر گئی تھی۔

پی کاک کے والد کا تبادلہ ہوا تو نیا اسٹیشن ماسٹر دھان پر آیا۔ اس کے ساتھ اسباب خانہ کے علاوہ کچھ تھا تو اس کی چھیتی بیوی تھی، وہ بھاری بدن کا جوان آدمی تھا لیکن اس کو دیکھ کر ایک ایسے سائٹر کا خیال آتا تھا جو پٹریوں کے بچوں پر چنگھاڑتے ہوئے ریلوے انجن کے سامنے کھڑا اپنے شباب سے بے خبر ہو گیا ہو۔ وہ بڑا کم سخن تھا۔ اس کی مونچھیں جھکی ہوئی تھیں، بالکل اس کی جھکی جھکی نظروں کی طرح۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن تک جاتا تھا تو اس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو اس طرح کٹکھینوں سے دیکھنا جیسے یہی انداز نظر اس کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔ ہم لوگوں کو اپنے گھر کا طوائف کرتے ہوئے دیکھ کر بھی اس کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ کبھی ہم سے نظریں چار کر کے اس التفات بے جا کی فہمت باز برس کرے۔ وہ اس طرح محبوب سا ہمارے برابر سے گزر جاتا جیسے ہم سے دڑتے دڑتے اپنے گھر جا رہا ہو۔

مورنی کی چال بڑی قیامت کی تھی۔ ہم اس کو کمزور سے پانی بھر بھر کر لے

لے جاتا ہوا دیکھنے اور دیکھتے ہی رہتے۔ واقعی یہ منظر دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا، آپ نے جنگل میں مور کو ناچتے ہوئے کبھی دیکھا ہے؟ آپ نے ہرن کو چوکڑی بھولتے ہوئے کبھی دیکھا ہے؟ مور فی منٹ دو منٹ کے وقفے سے یہ دونوں منظر یکے بعد دیگرے پیش کرتی۔ وہ اپنی چھوٹی سی خوبصورت سی بیتل کی مٹکی ایک جھکو ملے سے دوسری ہو کر کمر بڑکانے کے لیے اٹھالیتی تو ایسا معلوم ہوتا، جیسے بچوں سے لڑی ہوئی ٹہنی چٹختے چٹختے رہ گئی ہے۔ یا پھر دھنک ڈول کر ٹوٹ گئی ہے۔ پھر وہ مٹکی کو کوٹھے کا سہارا دیے کچھ اس طرح چبکتی جیسے مور فی جنگل میں ناچ رہی ہو، دیوی سنگھ نے اسی خواہم ناز پر فریفتہ ہو کر اس کا نام مور فی رکھا تھا۔ ہم برابر سے گزرتے ہوئے اس کو اس بات کا احساس دلاتے کہ ہم صرف اسی کے لیے یہاں چکر لگاتے پھرتے ہیں، تو وہ اپنی متوالی چال اس طرح بھول جاتی جیسے ہرنی چوکڑی بھرنے جاتی ہے۔ اس کی گاکر سے پانی پھلک پھلک کھجکھجکے جب گوتا تو ایسا لگتا جیسے مور فی کی سادی ہستی سوکھی دھرتی پر آئینہ بن کر گر رہی ہے۔

جب سے دیوی سنگھ نے نئے اسٹیشن ماسٹر کی بیوی کو مور فی کا نام دیا، ہم نے اس کو پی کا ک پکارنا شروع کر دیا۔

ہنسی ہنسی میں بات کچھ اس طرح چلی تھی کہ دیوی سنگھ اور عجیب شام کو میرے پاس آجاتے، ہم تینوں پہل قدمی کے لیے نکلتے تو ہمیں پانی کی مٹکی سے ہو کر گزرنایا پڑتا۔ مٹکی کے سامنے ہی نئے اسٹیشن ماسٹر کا کوارٹر تھا۔ ہم پہلی بار اُدھر سے گزرتے تو دیوی نے ٹھوکے دے کر ہمارے توجہ مور فی کی طرف

مبذول کرائی، جو اپنے لاسبے بال شاؤں پر بکھراے انھیں گنگھی سے سلجھا رہی تھی، پانی کی تسک کے نیچے پہنچ کر دیوی نے کہا بابا اب میں یہاں سے ایک قدم آگے نہیں چلنے کا۔ ہمت ہو تو تم لوگ بھی ٹھہرو، ورنہ چلتے بنو۔“

میں اور مجیب کچھ پس و پیش کے بعد آگے بڑھ گئے، تو دیوی اطمینان سے تسک کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھ گیا ہم نے کچھ دور جا کر لیٹ کر دیکھا تو وہ چھوٹے چھوٹے کنکراٹھا کر تسک کے نیچے ایک اتھلے سے گرٹھے کے ٹھہرے ہوئے پانی میں اتنی قوت سے مار رہا تھا کہ آواز ہمیں بھی سنائی دے رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اسٹیشن ماسٹر کی بیوی کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا، جو کھرکی میں کھڑے زلفیں سلجھا رہی تھی۔

اس کے بعد کچھ دنوں تک ہمارا یہ معمول ہو گیا کہ بس شام ہوئی اور پانی کی تسک کے نیچے جا پہنچے۔ ایک دو دن تو وہ ہمیں دیکھ کر کبھی کھرکی میں کبھی دروازے کی اوٹ میں آکھڑی ہوتی۔ لیکن پھر ہمیں دیکھتے ہی وہ بھپ جانے لگی۔ کچھ دیر منتظر ہونے کے بعد میں اور مجیب تو آگے بڑھ جاتے، دیوی وہیں ڈٹا رہتا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی آکر ہم میں شامل ہو جاتا لیکن جب بھی آتا بڑا اطمینان اور فالتوا۔ مجیب کو پھیر تاکہ مہارے لیے تو کسی عورت کو بس ایک نظر دیکھ لینا ہی بہت ہے۔ اس کے بعد تم اسے اپنے تصور میں لالا کر خراب کرتے ہو۔ مہارے نے ہجر کا لفظ بے معنی ہے۔ میں کسی پر نظر پڑی اور اسی شبصال ہو گیا۔ وہ کچھ بگڑتا، کچھ شرماتا، تو دیوی بھک کر اس کے کان میں کہتا کہ "مورنی کے ساتھ یہ سلوک نہ کرنا، وہ میری ہے۔"

اور واقعی اب وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ مورنی کو اپنی کہنے لگا تھا۔ اس خوش اعتمادی کی وجہ صرف یہ تھی کہ مورنی پانی کی ٹنکی سے میرے اور عجیب کے چلے جانے کے بعد جب دیوی کو تنہا کھڑا دیکھ پاتی، تو اس کو چھپ چھپ کر جھلک دکھاتی۔ بعد میں تو بات یہاں تک پہنچی تھی کہ دیوی خود ہمیں منع کرنے لگا تھا کہ ہم ٹنکی کی طرف نہ آئیں۔ اس لیے کہ اس کا رومانس ان دونوں شباب پر ہے۔

اس پوری رومانی ہم کے بھر کرنے کا سہرا چونکہ دیوی ہی کے سر جاتا تھا۔ اس لیے ہم نے بلا اختلاف رائے اس کو اپنا میر و تسلیم کر لیا اور اس کے راستے سے ہٹ آئے بس اسی دن سے وہ پی کاک پکارے جانے لگا اور نئے اسٹیشن ماسٹر کی بیوی کو تو اسی نے مورنی کا خطاب دے رکھا تھا۔

دیوی، اپنے بڑھتے ہوئے تعلقات کی روداد ہمیں سنا تا۔ ایک دن اس نے ہمیں بتایا کہ اب تو باضابطہ سلام و پیام بھی ہونے لگے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ بہت جلد تنہا رانی کاک، مورنی کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھا اسی کھڑکی میں سے تم دونوں کو اشارے کرے گا اور تم دونوں پانی کی ٹنکی کے نیچے کھڑے میری قسمت پر رشک کیا کرو گے۔

پی کاک تو فتح مندی کے ایسے خواب دیکھ رہا تھا اور ادھر نئے اسٹیشن ماسٹر نے ابا کے نام ایک چٹھی بھیجوادی تھی جس میں اس نے پی کاک کی اور عجیب کی محبت شکایت لکھی تھی کہ یہ دونوں دن اور رات کا بیشتر حصہ اس کے مکان کے اطراف گھومنے اور اس کی بیوی کو تاکنے اور اشارے کرنے میں گزارتے ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ آپ کے صاحبزادے بھی کبھی کبھی ان لوگوں کے ساتھ

ہوتے ہیں لیکن شاید اس کو نہیں معلوم کہ ان کے یہ دونوں دوست کس مقصد کے تحت میرے گھر کے چکر لگاتے ہیں۔ اس لیے بڑی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے اب اسے استدعا کی کہ وہ میرے توسط سے میرے دوستوں کو ادھر کا رخ کرنے سے باز رکھیں۔ ورنہ وہ پولس میں پی کا ک اور عجیب کے خلاف رجوع ہو جائے گا۔ اس نے اپنی بیوی کے حوالے سے یہ بھی لکھا کہ جب بات بہت بڑھنے لگی، تو کئی بار اسٹیشن پر آدمی بھیج کر چھٹی کے ذریعہ اس کی بیوی نے اس کو اطلاع دی کہ یہ لوگ پھر گھر کے سامنے آمو جو دہو رہے ہیں۔

ابا نے مجھے بلایا تو میرا عالم دیدنی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نیچے ہی نیچے کہیں دھنسی جا رہی ہے اور میں بھی اس کے تعاقب میں بلندیوں پر سے پھلانگ لگا کر نیچے آ رہا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح ان کے سامنے جا کر کھڑا رہ سکا۔ انھوں نے اسٹیشن ماسٹر کا خط میری طرف بڑھا دیا۔ مجھ میں نظر لانے کی تاب نہ تھی۔ انھوں نے کہا میری طرف دیکھو۔ میں نے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کہنے لگے۔ تمہارے دوستوں کی بُری صحبت کے تغلق سے مجھے سوچا پڑے گا۔ یہ باتیں تکلیف دہ حد تک بُری ہیں۔ آئندہ سے میں اس قسم کی کوئی شکایت نہیں سنوں گا۔ جا د یہ موط پڑھ لو۔ کن افسوس ناک ہملات میں مبتلا ہو گئے ہو تم لوگ۔

میں نے شام کو خط پی کا ک اور عجیب کو بکھلایا، تو عجیب نے فٹ فٹ تمیں کھالیں کہ اب کبھی وہ پانی کی ٹسکی کا رخ نہیں کرے گا۔ لیکن پی کا ک جیسے سچتر بن کر رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چہرے پر ہمیشہ جو ایک

گھلتاں کھلا رہتا تھا۔ وہ آج ایک ایسا ویرانہ بن گیا ہے جس نے خود و بچوں کی بھی صورت کبھی نہیں دیکھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے پی کاک اداکاری کر رہا ہے۔ اس حادثے کو اپنی عمر دگنی سے کچھ ایسا روپ دے رہا ہے کہ اس وقت بھی ہم اس سے ہمدردی کرنے کے قابل خود کو بنا سکیں۔ لیکن اس کا یہ اندازہ خودمانی مجھے کچھ چھپا نہیں۔ عجیب تو خیر توبہ استغفار پر اتر آیا تھا۔ اس کی انفعالیات اس کے لیے سپر بن گئی تھی اور وہ پوری ایمانداری سے یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ واقعی اس لیے غلط تھا کہ یہ سب کچھ "پی کاک" کے افسانے اور ترغیب دلانے پر ہوا تھا۔ ورنہ اس کا مزاج تو بس یہی تھا کہ عورت کو ایک بار دیکھا اور اپنے ذہن میں بسالیا۔ جب ضرورت پڑی، ذہن کی چار دیواری سے اس کو نکال کر اپنے پہلو میں لے آیا۔ اس میں نہ بدنامی کا خدشہ تھا۔ نہ کسی کے عتاب کا خوف۔ بس دل کو جو بھاگیا، نہ کوئی روک نہ مزاحمت، نہ پہرہ بندی۔ وہ پھر اپنی چار دیواری میں پناہ لینے کے لیے خود کو آمادہ کر چکا تھا۔ جس سے پی کاک اور میں اسے جبراً نکال کر باہر کی ہوا میں مائنس لینے کے لیے آئے تھے۔

بڑی ہی سنجیدگی سے مجھ سے مخاطب ہو کر پی کاک کہنے لگا۔

"میں نے کل ہی شام کو اس کا پہلا بوسہ لیا ہے"

"اور اسی بوسے کو آخری بوسہ سمجھ لو" عجیب نے اس کو پھیرا۔

اس نے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے پھر ایک بار نئے اسٹیشن ماسٹر کا خط پڑھا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا کہ خط اسے دے دوں۔

میں نے خط اس کو دے دیا، لیکن ساتھ ہی اصرار بھی کیا کہ صاف صاف

وہ بتاتا کیوں نہیں کہ اس خط سے وہ کیا کام لینے والا ہے اور اس کے دل میں
 آنسو کس قسم کا شک و شبہ ہے۔

پی کاک اب بھی سنجیدہ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ ختم کر مجھ سے بڑی
 لجاجت سے معافی مانگی۔ اس کو دکھ اس بات کا تھا کہ مورنی کے شوہر نے میرے
 ابا کو خط لکھ کر میری پوزیشن خواب کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس پوری رومانی
 ہم میں میری اور عجیب کی شمولیت تو بس ایک حد تک تھی کہ جب پی کاک نے
 اپنی پروان چڑھتی ہوئی محبت کی باتیں کیں ہم نے سنیں نہیں کھڑا۔ جب
 اس نے شورے لیے ہم نے اٹھے سیدھے شورے دیے اس کے ساتھ ہوئے
 تو کبھی کبھی مورنی کا دیدار بھی کر لیا ورنہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ اکیللا نہ ہوتا، تو
 مورنی اس کی سواگت کے لیے نہ دروازے تک آتی، نہ کھڑکی میں۔ کچھ بھی
 مجھے پی کاک کی طبیعت کے کھلنے پرے پن سے اتنی توقع بھی نہ تھی کہ ابا کے
 آگے میری اس سبکی کو وہ اس قدر اہمیت دے گا۔

میرے ہاتھ ختم لینے پر اس کو جذباتیت کا شکار دیکھ کر میں نے بہت
 نرمی سے پوچھا کہ اب وہ اس خط کا آخو کیا کرے گا۔

اس نے بڑے شوق سے کہا :

”مورنی کو دکھلاؤں گا۔“

”کیا کرے گی بے چاری“ میں نے مورنی سے سجدہ ردی کی۔

اب باقی کیا رکھا اس نے کرنے کو؟ اس کے شوہر نے لکھا ہے تاکہ اسٹیشن
 کو آدمی بھیج کر بھی مورنی نے ہمارے طواف کی اس کو اطلاع دی ہے۔

”میں ممکن ہے۔ پہلے پہلے اس نے ایسا کیا ہوگا“ عجیبے بھی حمایت کی۔

”اب تم نے کون سا تیرا لیا ہے، جو اس حد تک خوش فہمی کے شکار ہو کر وہ تمہارے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی۔“
پی کا کہنے لگا، تم لوگوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ سچ مانو یار، تمہارے پی کا کہنے کے انھیں ہونٹوں نے کل ہی رات اس کے ہونٹوں کا رس پیا ہے۔ میں کیا بتاؤں عجیب عورت ہے۔ جب میں نے اس کو بازوؤں میں لے کر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے سرد ہونٹوں پر رکھ دیے تو وہ سر سے پرتک باکل ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس کے سارے وجود میں گرمی کا اگر کہیں مجھے کچھ احساس ہوا تو صرف اس کے تپتے ہوئے آنسوؤں میں جو اس کی سند آنکھوں کے بوجھل پیوٹوں سے ڈھلک کر میری گالوں کو جھگور رہے تھے۔ برف کے ایک تودے سے گرم پانی کے بھرنے کی روانی۔ وہ کیفیت صرف محسوس کی جاسکتی ہے کہی نہیں جاسکتی۔

ابا باہر جانے کے لیے نکلے تو یکا یک ہماری انجن ناز درہم برہم ہو گئی۔ دیوی نے جانتے ہی آہستہ سے مجھ سے کہا کہ آج ہی مورنی سے لوں گا اور لمبے لمبے ڈنگ پھرتا ہوا بچے کی اوٹ سے گزر کر ابا کی نظروں سے بچ نکلا، عجیب تو جیسے زمین میں گڑ گڑ رہ گیا۔ نہ پایوں میں یار اتھا، نہ آنکھوں میں تاب نظار۔ ٹوٹ گویا بی گویا سلب ہو چکی تھی۔ ابا کے سامنے سے گزر جانے تک معلوم نہیں کتنی قیامتیں عجیب پر ڈوٹ گئیں۔ وہ چلے گئے تو میں نے سہارا لے کر

اسے کرسی پر بٹھایا۔ کچھ دیر بعد ہمارے پاس بجا ہوئے، تو پی کا ک کے اس طرح بکا بیک چلے جانے پر افسوس ہونے لگا۔ اس لیے بھی کہ آج وہ انکشافات کے موڈ میں تھا اور مورنی کی بے وفائی کا اتنا صدمہ اُسے ہوا تھا کہ وہ انتقاماً کسی راز کی پردہ داری کے لیے آمادہ نہ تھا۔

عجیب گردن جھکا کر اس طرح جدا ہوا جیسے خونِ دہ عالم اس کی گردن پر ہمی ہو۔

دو دن تک ان دونوں میں سے کوئی نہیں آیا اور میری شامیں تنہائیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

تیسرے دن کھڑی دوپہر کے وقت جبکہ اباد فتر میں تھے پی کا ک بڑے ٹھٹھے کا فل سوٹ پہنے تجھ سے ملنے آدھکا۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کر فی چاہی اور واقعی حقیقت بھی یہی تھی کہ اب تجھ سے بالکل ناراض نہ تھے اور نہ ہی میرے دوستوں سے۔ ہمارے ساتھ جو روپیہ انھوں نے اختیار کیا تھا، وہی ہماری سرزنش کے لیے کافی تھا اور وہ جانتے تھے کہ میرے لیے یہی بہت کچھ ہے۔

پی کا ک نے وعدہ کیا کہ آج شام سے وہ برابر آئے گا اور عجیب کو بھی ساتھ لیتا آئے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان دونوں کے درمیان کچھ اور عجیب برابر ملنے رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے اور بھی تکلیف ہوئی کہ میرے حق میں بےوجہ اداس اداس شامیں آئیں۔

آج اس قدر بن بھن کر نکلنے کا سبب میں نے پوچھا، تو پی کا ک مسکرانے لگا۔

میرے اصرار پر اس نے کہا۔ "بس ان دنوں تو بن ٹھن کر رہنے ہی کو
جی چاہتا ہے۔"

"آخر بتانا کچھ۔" میں نے بے تکلفی کے ناطے اپنے حقوق کا اظہار کیا۔
"اب تمہیں کیسے بتاؤں؟" وہ کہنے لگا، "کہ کوئی ہمارا منتظر ہے، کسی کی
آنکھ ہمارے لیے کھل چکھی ہے۔ کوئی رات بھر ہمارے لیے کھڑا رہتا
رہتا ہے، کسی کی آنکھیں پو پھٹنے سے ہمارے انتظار میں نہیں بھپکتیں۔ کسی کو
ہر آہٹ پر ہمارا آمد کا گمان ہوتا ہے۔"

"یو بھی صل دیے" اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے ہاتھ تھام کر کرسی پر اس کو ڈھکیں دیا "بہت موڈ میں ہو میں
نے کہا۔" شاعری تو گھر کی باندی لگتی ہے۔"

"لم دھڑنگ نی کاک اپنی ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے کرسی پر نیم دراز
ہو گیا۔ اس نے کپڑے ٹن بھل کھول لیے تو میں نے کہا، "مائی بھی ڈھیلی کھو لو۔"

وہ کہنے لگا۔ "اتنا بھی نہیں۔ جو کچھ کیا ہے، وہی تمہاری دوستی
کی خاطر، ورنہ میرے پاس تو ان دنوں فالٹو وقت بالکل نہیں ہے۔"

پی کاک کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے اس کی کامرانی اور کامیابی کا اعتراف
کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"کیسی ہے مورنی؟" میں نے گویا آغاز کر ہی دیا۔

وہ کرسی قریب گھسیٹ کر سیدھا ہو بیٹھا، اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو میری

طرت جھک گیا۔

”جس شام تم سے خط لے گیا ہوں، وہ ساری رات مورنی ہی کے بستر پر بسر کی ہے۔“

میں نے مذاق اڑایا۔ ”ڈینگلیں مت مارا کرو جی۔“
 ”اچھا جی، وہ تن گیا۔ یقین نہیں آتا ہے نا، چلتے وقت کان کپڑ کر باقی کی ٹنگی تنک لے جاؤں گا۔ کرسکو گے تم؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو بس، اس۔ مذہبات جاری رکھی۔ تمہیں تنکی کے نیچے کمپرسی کے عالم میں چھوڑ کر دیکھنا کس شان سے مورنی کے گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ دیکھنا کہ وہ کس خوشی سے وہ میرا سا گت کرتی ہے۔ دیکھنا کہ کس طرح اس کو اپنی بانہوں میں لے کر چومتا ہوں۔ اپنا دامغانی توازن قائم رکھ سکو گے؟“

میں نے اثبات میں پھر سر ہلایا۔

”تو تم خط دکھا کر اس کی خبر لینے والے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں رات بھر میں نے صرف پیار ہی نہیں کیا پہلے اس کی خبر لی، پھر خود اس کو آغوش میں لے لیا۔ تم کھانا بیک وقت کس قدر سادہ بھی ہے وہ اور کس قدر پرکالہ بھی۔ اس کی کیا کیا تعریف کروں، جسم تو یوں سمجھو جیسے رات بھر بستر پر بچلیاں تڑپ رہی تھیں۔ ناگن کی طرح بل کھاتی ہے۔ لیکن ڈسنا جاتی ہی نہیں۔ جب چاہو موم لے کی طرح مٹی میں بند کر کے سینے میں پھپھالو۔ مورنی کے حُسن سے اس کے چھینٹے اور پکارتے ہوئے بدن سے اس کی سرد اور ریخ بستر روح کو جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ تم نے لپکتے ہوئے شعلوں اور گوتی ہوئی برت کا اقبال سمجھ دیکھا ہے؟ میں نے جب بھی اس کا ترسا چاہا۔ اس

نے جب بھی اس کے وجود کو اپنے وجود میں ضم کر لینا چاہا، مجھے ایسا لگا کہ شعلے برف پر لپک رہے ہیں۔ اس نے جب اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا، تو صرف اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی حدت تھی۔ جو مجھے گرمی کا احساس دلارہی تھی۔ انگارے برف پر گرتے رہیں بھی تو کیا حاصل۔ برف جل اٹھنے سے تو رہی۔ انگارے خود ہی جل بجھیں گے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا اور میں سرد پڑ گیا۔ سنتا تھا کہ عورت کبھی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ میں آج بھی اس بات کو نہیں مانتا ہوں لیکن اس دخت نورانی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں اس کو چھوڑ کر جب اس سے الگ ہو گیا، تو اپنی فتح پر ندامت کا احساس غالب تھا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بھر کہنے لگا "مورنی تو پھلوں سے لہی ہوئی و شاخ کھٹی جس نے خود بھاک کو مجھے پھل توڑ لینے کے لیے اکسایا اور جب لڑکھو بڑھا کر میں نے اپنی مضبوط گرفت میں اس ٹہنی کے سرے کو حلقم لیا تو پھلوں اور شاخ پر برف ہی برف جمی ہوئی تھی، جو کچھ ایسی بخت تھی کہ نہ کھلتی تھی، نہ پانی بن کر بہتی تھی۔"

"وہ دیر تک اپنی ہچکیوں کو دباتی رہی۔ میں بے بس سا اس کے سر پر ہاتھ بیٹھا ہوا اس کی لمبی سیاہ زلفوں میں اپنی انگلیاں پھیرتا رہا۔ وہ اٹھ بیٹھی تو اس شانہ کھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ عورت جس کے انداز سپردگی نے میری رگ رگ میں آتش سیال دوڑا دی تھی، اپنا سب کچھ بیچ دینے تک کڑکراتی سردیوں کی رات میں پڑی ہوئی پتھر کی سل کس طرح بن گئی تھی۔

مورنی تک میں تو یہ سمجھ کر بڑھ آیا تھا کہ اس کی تشنگی کی تسکین کا باعث

بنوں لگا۔ لیکن تشنگی کیا مورنی کے پاس تو دور دور تک کسی خبسی جذبے کا بھٹی گزرا نہ تھا، وہ تو سردرات کا اوس میں بھٹکا ہوا پتھر تھی، وہ برت کی ایک سل تھی جس کے اطراف میں نے آگ جلانے کی کوشش کی تھی۔

وہ کچھ سنبھلی، تو میں نے اس کو پکارا، مورنی، تم کیا ہو۔ کہاں ہو اودیہ سب کچھ آخر کیوں ہے۔ مجھے لگا کہ میری ہی آواز میں، تجھے خود میں، نہیں کوئی اور پکار رہا ہے۔ کبھی قریب سے کبھی اتنی دور سے کہ آواز پہچانی نہیں جا رہی۔ وہ جب کچھ نا مل ہو گئی، تو میں نے اس کے کپڑے اپنے ہی ہاتھوں سے درست کیے۔ بالکل اس طرح جیسے پتھر سے ترشی ہوئی حسین عورت کے اسٹیو کو میں کپڑوں میں لپیٹ کر بچھا رہا ہوں کہ کہیں میرا جذبہ حیوانی اپنے ہی احسانات کی جواحت نہ بن جائے۔

”میں نے کتنی ہی ادھر ادھر کی باتیں اس سے کیں۔ طرح طرح سے اس کا دل بہلایا۔ بس میری خواہش یہی تھی کہ وہ صرف ایک بار مسکرا دے۔ تاکہ اس کی اس مسکراہٹ کے سہارے میں اس روز تک پہنچ سکوں جس پر اس کے آنسوؤں نے نکتے ہی دبیز پردے ڈال دیے تھے۔“

”آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی اور اس کے بعد پھر میں نے اس سے قرب کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جاہیاں لینے لگی۔ تو میں نے بڑے چاؤ سے سہارا دے کر اس کو سینے سے لگالیا اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس کے دھماکوں سے چھٹے ہوئے ان چند بالوں کو برابر کرنے لگا، جو خشک آنسوؤں کے سہارے اس کے تھمتانے والوں پر سیاہ لکیریں بن گئے تھے۔

میری انگلیاں اس کے شانوں پر گردن کے قریب پہنچیں تو اس کو گد گدی ہوئی اور وہ بیکامیک پھلجھڑی کی طرح مسکرا اٹھی، میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اس کو پھر گد گدایا، وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ میں اس کو پھر گد گد کر بستر پر بٹپتی ہوئی بجلیوں کا سماں دیکھا۔ جب میری آنکھیں چندھیا نے لگی تو میرا جی چاہا کہ پتھر کے اسٹینچو کے خوبصورت جسم سے دھک پڑے اتار دوں جن سے میں نے ابھی ابھی اس کو ڈھک دیا تھا۔ اس لیے کہ یہ اسٹینچو اب سانس لے رہا تھا۔

”مورنی۔ میں اس کو اسی نام سے پکارتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو یا پھر میری سمجھ میں آجاؤ مورنی۔ تم ایک منہ بن گئی ہو جس کے آڑے اور کھڑے اشارے نہ کہیں ملتے ہیں، نہ کوئی لفظ وجود میں آتا ہے۔ میری اس التجا کو بڑی غور سے سن کر وہ مسکرائی۔“

پھر مسکرا کر اس نے کہا ”اب سمجھ سکتے ہو مجھے؟“

”ہاں۔“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”آنہ تم مردوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ بس یہی بات ہے نا؟“

میں لا جواب ہو کر بس ٹکڑ ٹکڑ اس کو دیکھتا رہا۔

”مجھے پتہ چلے یہ۔“ اور بجلی کی طرح کود ڈلے کہ اس نے اپنا چہرہ میری آنکھوں میں چھپایا۔

”تو پھر اس میں رونے کی کیا بات تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے

پوچھا۔

وہ کچھ دیر پھت کو تکتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ میرا آنکھن سونا ہے اور اسی لیے

لیے تو میں اپنے بچے کی تلاش میں یہاں تک چلی آئی ہوں کہ تمہارا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ سکوں۔ زندگی ویسے بھی گزر سکتی تھی۔ بنجر دھرتی کا رکھوالا اگر اس کے بنجر ہونے پر ہی خوش ہو تو دھرتی کا کیا جاتا ہے۔ لیکن عورت شاید تخلیق کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بیوی اور بہن بچا رہا جانے والی تمہاری مور فی کوئی اٹھ سال سے ماں بچا رہے جانے کے لیے ترس رہی ہے۔

”اب شاید تمہارے سمجھ میں آگئی ہوں گی“

”آ نہیں گئی ہو۔ کچھ کچھ آ رہی ہو۔“

میرے آنے صرف اس لیے تھے کہ آنے والے جہان کی آمد کی امیدیں میں نے کتنی بڑی قیمت ادا کر دی ہے۔

”تمہاری مور فی کو اس کی بد نصیبی نے تمہاری آغوش میں پھینک دیا ہے“ پی کا ک۔ مجھے معاف کر دو میں یہی ساری اوٹ پٹانگ باتیں سوچ سوچ کر بادی ہوئی رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اتنے بڑے سارے آئینہ تہا میوں میں جی کھول کر دینے کے باوجود میری آنکھوں میں کیسے بچ رہے ہیں؟ مجھے محسوس ہوا کہ میں بچ رہا ہوں۔

لیکن خوبصورت عورت کا اسٹیج، جو سانس لینے لگا تھا، اب زندہ ہو چکا تھا۔

مجھے بچہ دو گے نا۔ سمکتا ہوا۔ کلکتا ہوا۔ اتنا سا، ننھا۔

پھر مور فی کا خوبصورت اور گرم جسم رات بھر صرف میرے لیے تھا اور اس کی روح بے تہ نہیں اپنے شوہر کے پاس تھی جو اسٹیشن پر نائٹ ڈیوٹی کرتا ہوا اسے

جانے والے مسافروں کی حفاظت کر رہا تھا یا اس جہان کے پاس جس کے انتظار میں
مورنی کا آنکھن سونا ہے، اس کی روح پیاسی ہے۔

میں پی کاک کی باتیں اس طرح سنتا رہا جیسے مجھے سامنے سونگھ گیا ہو۔ پی
کاک واقعی بہت متاثر تھا۔ میں نے بھی اپنے تاثر کو دانستہ طور پر چھپاتے ہوئے
پی کاک کو پھیرا۔

”تم اس کی تجبوری اور کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے اب وہیں جا
رہے ہو۔“

”پی کاک، ایسا ہی کھنڈر ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اس پر طنز کر رہا ہوں
کہنے لگا۔“ ”جی کیا اب آپ اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔“

”کیا تم نے مورنی کے شوہر سے مل کر باضابطہ اجازت لے لی ہے جو اس
قدر ڈھیٹ ہو گئے ہو کہ دن اور رات دونوں بٹھا رہے ہیں۔“

”اب تو اس کو مجھ سے اجازت لینا پڑے گی۔“

میں ہنس پڑا۔

پی کاک نے بتایا کہ مورنی کا شوہر سرکاری کام سے اپنے ہیڈ آفس گیا
ہوا ہے اور ابھی کوئی تین روز تک اسی کی حکمرانی ہے۔

”تمہیں یاد ہے کہ میں نے تم سے کیا پوچھا تھا اور جواب میں تم نے اصل
بات تو گول کر دی۔ میں لگے اپنے معاشرے کی داستان سناتے۔“

وہ سوچنے لگا۔

میں نے پھر یاد دلایا کہ مورنی کے شوہر کا خط پڑھ کر جس برہمی کا تم نے اظہار

کیا تھا، وہ شاید اسی روز پیاد میں بدل گئی۔
 سچ کہا۔ اس نے تہقہ لگا کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے مصافحہ کیا، تو اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے ہوئے اتنا کہا:
 ”مورنی کہتی تھی کہ میرا شوہر اب حد درجہ مطمئن ہو گیا ہے۔ میں نے ہی اس کو اکسا کر یہ خط لکھوایا ہے۔ ورنہ وہ ہیڈ آفس جانے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔“
 ”بڑی کامیابیاں اور پرفتن معلوم ہوتی ہے تمہاری مورنی۔“ میں نے کہا۔
 ”اتنی ہی معصوم بھی۔“ اس نے اضافہ کیا۔
 مصدومیت تو اس پوری روداد میں کہیں نہیں جھلکتی۔ میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”تم جلنے لگے ہو یا اس سے۔“

اس طرح پی کاک نے میرا پتہ کاٹا اور ہاتھ پھڑا کر چلتا بنا، جس کو میں ابھی تک تھامے ہوئے تھا۔

شام کو عجیب مجھ سے ملنے آیا تو ہم دونوں صرف پی کاک اور مورنی کی باتیں کرتے رہے۔ گھومنے کے لیے نکلے، تو دلوں کے چور نے پانی کی ٹسکی کے نیچے تک جیسے راہ نمائی کی۔ مورنی کی کھرک کی طرف نظریں اٹھیں، تو پی کاک آئینے کے سامنے کھڑا مانگ نکالی رہا تھا۔ اس نے ہم کو دیکھا تو ہاتھ سے ٹھہرنے کے لیے اشارہ کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہمارے پاس آہنچا۔

عجیب نے کہا ہمیں ملاؤ نا اپنی مورنی سے۔

”کیا کرو گے مل کو۔ مجھ سے کوئی دشمنی کرنی چاہتے ہو۔ وہ تو تم لوگوں

کو یہاں دیکھ بھی لے تو مجھ سے خفا ہو جائے گی۔ اس کا حکم ہے کہ یہ راز سولے اس کے اور میرے کسی کو معلوم نہ ہو۔ وہ نہانے کے لیے یا تھرا روم میں گئی ہوئی ہے۔ سچ و سچ کو بناؤ سنگھار کر کے نکلتے گی تاکہ رات مجھے قتل کر سکے۔ اچھا جاؤ اب یہاں مت ٹھہرو، ورنہ مجھے تہاڑے بزرگوں کو خط لکھنا پڑے گا کہ میری معشتہ پر ڈورے ڈال رہے ہو۔“

”اچھا جی۔“

ہم مینیوں نے قہقہہ لگایا۔ اور وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر ہاتھ کے اشارے سے گڈ بانی کہتا ہوا بورنی کے گھر کی طرف لوٹ گیا۔ واقعی پی کاک پر ہمیں رشک آ رہا تھا۔

محب کہنے لگا، ”حرام زادہ بہت مزے کر رہا ہے۔ ایسی کی تیسی“ یہ بات اس نے اس طرح کہی جیسے کہنا چاہتا ہو کہ آج میں بھی تصویر میں گھسیٹ لوں گا اس کی معشتہ کو۔ رات بھر نہیں پھوڑوں گا۔

کالج کھل گئے تو میں اور محب شہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ پی کاک کتابوں کا کٹر اٹھا۔ ہمیشہ اچھے ممبروں سے کامیاب ہوتا، اس سال تو وہ امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوا تھا۔ وہ چونکہ شہر جانے والا تھا اس لیے اس کے والد اس کو وداع کرنے کے لیے اپنے مستقر سے رخصت پر ودھان پور آئے تھے ہم اسٹیشن پہنچے تو خلافِ امید وہ بھی ایسا سوٹ کسین سنبھالے موجود تھا۔ ہمیں اچھینھا ضرور ہوا لیکن سوائے خاموشی کے کوئی جارہ نہ تھا۔ اس کے والد بھی اس کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ جب گاڑی چلنے لگی

اور پانی کی ٹسکی کے قریب پہنچی تو اس نے کھلے دروازے میں کھڑے ہو کر اپنے
لبے لبے ہاتھ ہلائے۔ مورنی نے بھی کواڑ کی اوٹ سے ہاتھ ہلا کر اس کو وداع
کیا۔ جب ٹرین فرارٹے بھرنے لگی، تو پی کاک نے اپنا سوٹ کیس برتھ پر سے
اتار لیا اور دروازہ بھیڑ کر ہمارے پاس برتھ پر آ بیٹھا۔

میں نے سوٹ کیس دروازے کے پاس رکھنے کا سبب پوچھا تو وہ مسکرا کر
کہنے لگا آنے والے اسٹیشن پر گاڑی بہت کم بٹھرتی ہے۔
مجھے شاید اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دوسری گاڑی سے جو
ودھان پور کی طرف جاتی ہے پی کاک لوٹ جانے والا تھا۔

لیکن عجیب نے اس سے پوچھ ہی لیا۔
”ہمتیں آنے والے اسٹیشن سے کیا تعلق؟“

”جو تعلق مسافر کو منزل سے ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر تم اپنی منزل پیچھے چھوڑ کر یہاں تک کیوں چلے آئے؟“

”واپس لوٹنے کے لیے بدھورام۔ تیرا جی کی خاطر یہاں تک آیا ہوں۔
مورنی کی خاطر لوٹ جاؤں گا۔ زندگی کے چند حسین ترین لمحے سادی زندگی سے
بھی زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ میری قسمت میں تو مکمل ایک دن اور ایک
سادی رات باقی ہے۔ تم میری خوش نصیبی کا تو اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ میں
جب چلا تھا تو مورنی بے چین تھی۔ اب وہ مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی ہے۔
میں نے برف کی سل کا سینہ چیر کر انگارے رکھ دیئے ہیں اور اب لپکتے ہوئے
شعلوں کا سماں دیکھ رہا ہوں۔“

پھر وہ مسلسل مورنی کی باتیں کرتا رہا۔
اسٹیشن آیا تو پی کاک نے دوسرے دن کالج میں ملنے کا وعدہ کیا
اور انزگیا۔

کالج کی ہماہمی نے مورنی کو ہمارے ذہنوں سے آہستہ آہستہ محو کر دیا۔
پی کاک دوسرے دن لوٹ تو آیا لیکن کوئی چار یا پنج دن تک ہم سے اس کی
ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ سائنس کالج کا طالب علم تھا اس لیے ہم روزانہ کم ہی
ملتے تھے۔ ہمارے آرٹس کالج میں اور اس کے کالج کے درمیان فاصلہ کچھ زیادہ
ہی تھا۔ ہاں جب کبھی پی کاک سے ملاقات ہو جاتی اس کے نام کی مناسبت
سے مورنی کا خیال بھی ضرور آ جاتا۔ یوں بھی مورنی سے ہماری ذہنی یگانگت
کی کوئی وجہ بھی نہ تھی، جو وہ ہمیں دنوں تک یاد رہتی۔ وہ جو کچھ تھی پی کاک
کے لیے تھی اور پتہ نہیں پی کاک نے کس کس طرح اس کو اپنے خیالوں میں بار کھا تھا۔
دن گزرتے گئے اور پی کاک کو ہماری ہی طرح زیادہ دوستوں نے اسی
نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ بعضوں نے پہلے پہل وجہ قسمیہ جاننے کی کوشش کی
پھر یہی جان کر مطمئن ہو گئے کہ ہم چاروں میں دیو سی سنگھ کو پی کاک پکارتے ہیں۔
اب وہ اتنی زبانوں سے پی کاک پکارا جاتا کہ دوستوں میں اس کالج کا نام
پڑ گیا اور اب پی کاک ملتا بھی تو مورنی یا دن آتی۔

ہاں پی کاک سے میں تنہا ملتا اور کوئی دوسرا نہ ہوتا، تو وہ ضرور مورنی کو
یاد کر لیتا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ یادیں بھی گھڑی کی دھمک دھمک بن کر رہ گئیں جن
پر کبھی ہم نے کبھی دھیان دیا تھا اور آج جو وقت کے قدموں کی ایک ایسی چاپ

ہو کر رہ گئی تھیں جس کو شاید ہم سنتے بھی نہ تھے۔

ایک رات اپنی ہاکی ٹیم کے ہار جانے پر میں بڑا مغموم تھا۔ دوسرے سال کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔ اس سال بھی شیلڈ ہمارے کالج کو ملتا تو ہم کھلاڑیوں کی تعطیلات کا بڑا حصہ اس خوشی میں کشمیر کی سیر و تفریح میں گزرنے والا تھا۔ ابآ کا تبادلہ ددھان پور سے ہو چکا تھا۔ میں ان کے نئے مستقر پر چھٹیاں گزارنے کے قصد سے یوں بھی ادا اس تھا کہ وہاں کوئی میرا دوست نہ تھا۔ پی کا ک اور عجیب پھر ددھان پور میں ایک جا ہونے والے تھے۔ جی اچاٹ اچاٹ سا ہو گیا تھا۔

میں نے کمرے پر تالا ڈال کر باہر جانے کا قصد کیا۔ سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ پی کا ک تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا ہوا میرے برابر سے گزر گیا۔ اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑی بھی نہیں۔ میں نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ پلٹ کر دو ہی جست میں مجھ تک پہنچا۔ اس کا عالم دیدنی تھا۔ وہ اس قدر عجلت میں تھا جیسے چاہتا ہو کہ پھر ایک بار گھڑی کی ہر ٹک ٹک کو اپنے قبضے و دسترس میں لے لے اور اڑتے ہوئے لمحے اس کے حضور عجم ہو کر دست بستہ ہو جائیں۔

”برادر کمرے کا میری؟“

”کیا افتاد پڑی ہے آخر؟“

”مورنی میرے ساتھ ہے۔ میں اس کو باہر کیسی میں بیٹھا آیا ہوں۔ وہ اس گاڑی سے اپنے نئے مستقر جا رہی ہے۔ اس کا شوہر وہیں ہے۔ ددھان پور سے اس کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے چلی آئی ہے۔“

”تم چاہتے کیا ہو“ میں نے اس کی بے ربط باتیں سن کر پوچھا۔
 ”ٹرین ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے۔ میں اس کو یہاں لے آیا ہوں کہ تمہارے
 کمرے میں سکون اور اطمینان سے جی بھر کر باتیں کروں۔ تمہارا سنگل روم ہے
 ورنہ میں اسے اپنے ہاسٹل لے جاتا۔“

ایک ہی سانس میں وہ ساری باتیں کہہ گیا۔
 ہوٹل انچارج راولڈ لے کر جا چکا تھا۔ اس لیے میں نے حامی بھری اور
 اپنی چابی اس کے حوالے کر دی۔

میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مجھے بھی موٹر تک لے گیا۔ پھر خود ہی کچھ سوچ کر مجھے
 کچھ دور ہٹ جانے کے لیے کہا۔

مورنی موٹر سے اترتی تو میں ابھی طرح اس کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا حسن
 اور نکھر آیا تھا۔ اس کے سینے سے ایک چھوٹا سا صحت مند اور توانا بچہ چٹا ہوا
 ہے۔ جس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ میرے
 ذہن میں ریزہ ریزہ یادوں کی کتنی سی کرچیاں کھٹک رہی تھیں۔ مجھے حیرت
 اس بات پر تھی کہ پی کاک نے مورنی کی گودہری ہونے کی بات مجھے کیوں نہیں
 بتائی۔ آج اتفاقیہ طور پر یہ سب کچھ میرے سامنے نہ آ جاتا تو گویا اس جیتی
 جاگتی کہانی کا خاتمہ ایک ایسے موٹر پر ہو جاتا جہاں صرف گھپ اندھیرا ہوتا
 ایسا اندھیرا جہاں آنکھوں کا تو کیا ذکر دل ابھی دل کو نہیں دیکھ سکتا ہو۔
 پی کاک نے بچے کو مورنی کی گود سے لے لیا اور اشارے سے مجھے
 اس کی طرف متوجہ کیا۔

اور اس سے پہلے کہ میں بھی اشارہ اس سے یہ کہتا کہ ہاں میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر چٹاٹ نیچے کو چومنے لگا۔ کاش میں اس وقت مورنی کے اتنا قریب ہوتا کہ اس کے چہرے پر ممتا کی ریکھائیں پڑھ سکتا اور انھیں دیکھاؤں میں کسی چھپے ہوئے درد کی پرچھائیاں بھی مجھے نظر آئیں۔

میں تو مورنی سے اتنے فاصلے پر تھا کہ مجھے اس کے چہرے پر صرف شگفتن گل ہائے ناز کا سماں نظر آ رہا تھا وہ کانٹے جو کھلتی ہوئی کلیوں کی نیکھڑیوں کو جو احتیاج بخش رہے تھے، میری نظروں سے بالکل چھپے ہوئے تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں مورنی سے قریب ہوتا تو مجھے ان کانٹوں کی جو احتیاج اس کے چہرے پر ضرور نظر آتیں۔

میں کچھ اور بھی ادا اس ہو گیا۔ در اک حالیکہ اس ادا سی کی کوئی اس سے نہ تھی۔

ادھر ادھر بے مقصد گھوم پھر کر میں اپنے کمرے پر لوٹا، تو بی کاک، مورنی اور ان کا بچہ ابھی وہیں تھے۔ میں لوٹنے لگا تو وہ بی سٹیکوں نے گویا میرا رستہ روک لیا۔ میں اپنے پر جبر کر کے آگے بڑھ آیا۔ لیکن سسکیاں براہ میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں نے قدم تیز کیے ہی تھے کہ پیچھے سے تھپٹ کر بی کاک نے مجھے روک لیا۔

وہ بڑا گھبراہٹ ہوا تھا۔

”گاڑی کا وقت ہو رہا ہے“ وہ کہنے لگا۔ ”سیکی لے آؤ گے؟“

”جی — میں نے کہا ”ضرور لے آؤں گا۔ لیکن کیا تم مورنی کو اس عالم میں جدا کر دو گے؟“

”جی نہیں، رات یہیں بسر کروں گا۔ تاکہ ہوٹل سے کل آپ کا نسخہ کالا کر داسکوں۔“

مجھے اپنے سوال کے بے معنی ہونے کا احساس ہوا لیکن میرا سوال بے معنی بھی تو نہیں تھا۔ وہ تو پی کا ک نے تو اس کو ایسے معنی پہنا دیے تھے۔

”کسی میں سوار ہونے کے لیے مورنی کمرے سے نکلی تو ننھا پی کا ک کی گود میں تھا۔ اس نے قریب لاکھ مجھے ننھے کو دکھلایا۔ واقعی یہ تو چھوٹا سا پی کا ک تھا۔“

مورنی کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر اب کہیں شگفتن گل ہائے ناز کا وہ سماں تھا ہی نہیں جو میں نے موٹر سے اترتے وقت دیکھا تھا۔ اب تو مجھے صرف جواحتس نظر آرہی تھیں، جو ایک جاہلو کو ایک عورت کا چہرہ بن گئی تھی۔

پی کا ک، مورنی کے برابر بیٹھ گیا تو موٹر روانہ ہو گیا۔ ہاتھ پھیلا کر مورنی نے ننھے کو پی کا ک کی آغوش سے کب لے لیا، میں یہ بھی تو نہ دیکھ سکا۔

مجھے یقین تھا کہ پی کا ک لوٹ کر پھر میرے کمرے میں آئے گا چنانچہ یہی ہوا۔

وہ لوٹا تو کچھ اداس اداس تھا۔

میرے دماغ میں وہ سسکیاں ابھی تک گونج رہی تھیں، جو ابھی ابھی

میں نے سنی تھیں۔ وہ گم سُم بیٹھا رہا تو میں نے مورنی کے اس قدر ادا اس واپس بٹٹنے کا سبب پوچھا۔

پی کا کہ ہاں کر کے اس طرح ٹالتا رہا جیسے کوئی بات شروع کرنا چاہتا ہو، لیکن سمجھائی نہ دے رہا ہو کہ شروع کس طرح کی جاتے۔
میں بھی خاموش رہا۔ پھر اس نے خود کہا۔
”میں نے اس سے زیادتی کی یار۔“

میں اس وقت بھی خاموش رہا۔ میں تاڑ گیا تھا اسے اب وہ خود ہی سب کچھ بتا دینا چاہتا ہے تاکہ اس دکھ کی گراں باری سے نجات پاسکے جس کا بوجھ وہ اپنے سینے پر محسوس کر رہا ہے۔
”واقعی میں نے اس سے زیادتی کی یار۔“

”لیکن جاتے سمے اس نے میرے پیر پھولیے۔ میرے پاؤں کی خاک اپنی پیشانی پر لگالی۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور پاؤں رکھنے کی کوشش کی، تو اس نے مجھ سے کہا بہتیں اس امانت کی سو گند ہے، اگر تم نے مجھے معاف نہیں کیا اور اس نے نسخے کے لیے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیے۔ میں نے جب یہ نسخہ سی امانت اس کو سونپ دی تو اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اپنے سارے وجود کو مجھ پر کھینچ کر رکھ رہی ہو۔“

”میری نظریں خود بخود جھٹک گئیں۔“

”میری نظریں، جو اس کی تقدیر کے آگے ہٹیاں تھیں۔“

وہ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں سمجھ گیا کہ

وہ مجھے نہیں دیکھ رہا ہے۔

پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

”تم ان کی سسکیوں کا سبب جان گئے ہو نا جو تم نے سنی تھیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

لیکن پی کا ک کی تشفی نہ ہوئی۔ ”کیا سمجھے تم؟“ وہ پوچھ بیٹھا۔

یہی کہ مورنی کا وہ جسم جو مہارے لیے سب کچھ تھا، مورنی کی سسکیوں نے اس کی روح بچھین کر تمہیں دے دی اور تم اس کے جسم تک نہ پہنچ سکو گے۔

”بالکل ٹھیک“ وہ کہنے لگا ”عجب عورت ہے یار۔“

وہ صرف ماں ہی ماں نظر آتی ہے۔“

اس نے اپنی جیب سے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر میرے آگے بڑھا دی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھا۔

مورنی، ننھے پربھکی اور ندھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی رعنائیاں صرف ماتا بن کر رہ گئی تھیں۔

میں نے فون ٹن پین کھول کر تصویر کے نیچے ”ماں“ لکھا اور پی کا ک

کو لوٹا دی۔

اس نے مجھ سے فون ٹن پین مانگا۔ میں نے دے دیا تو اس نے بھی کچھ لکھا۔ میں نے دیکھا، اس نے بھی ایک بھونٹی سی لکیر کھینچ کر پھر ”ماں“ لکھ دیا

تھا۔

شیبا

بند کمرے کے درتپکے کھلنے لگے اور ہوا کے تازہ جھونکے ماضی کی ساری یادیں سمیٹے ہوئے اس کے نہاں خانہ دل میں در آئے۔ میں اس کے مقابل بیٹھا ہوا اس کی شخصیت کی شفاف سطح کو کھردرا ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ وہ حسرتیں اور محرومیاں جو اس کے مزاج کی سنجیدگی بن گئی تھیں بڑھتے بڑھتے اب اس کا مزاج ہی بن بیٹھیں، اس طرح کہ خود اسے بھی ان حسرتوں کے سہارے اس قدر دور نکل آنے کا کوئی احساس تک نہیں ہوا۔

میں اپنی رجسٹر میں سب سے کم عمر فوجی افسر تھا۔

اس نے فرج میں رکھی ہوئی ٹھنڈی بیر کی دوسری بوتل اٹھائی اور اس پر اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ پھر بڑے چاؤ سے اس نے اس بوتل سے اپنے گال لگا دیے

پھر بڑی احتیاط سے بونل کھول کر مگ بھرا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

اپنی بھولی بیری یادوں کی گٹھری اس نے کھول کر میرے سامنے جیسے بچھا دی۔ میں نے اس گٹھری میں سے گرد میں اٹی ہوئی فوجی وردی اٹھالی اور بھاڑ بھٹاک کر جیسے اس کی طرف بڑھا دی اور پلک بھپکتے اس نے ہی وردی زیب تن کر لی اور بڑی گمبیرتا اور بانچکن کے ساتھ میرے مقابل بیٹھا مسکانے لگا۔ فرج میں رکھی ہوئی بیر کی پہلی ٹھنڈی بوتل ختم کر کے جب وہ دوسری بوتل اٹھاتا تو میں اس فوجی افسر کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں جو مسعود الزماں زیدی کی تہہ در تہہ شخصیت میں اس طرح بچھا رہتا جیسے منوں مٹی کے نیچے لیک مردہ ذہن، ایک مردہ دماغ، ایک مردہ دل جو بجائے خود کبھی ایک چلتی پھرتی دنیا ہوا ہو گا ایک چلتا پھرتا عالم کا عالم۔

وہ اپنا مگ میز پر رکھ کر اس میں پڑی ہوئی ٹھنڈی بیر کو آنکھوں سے پیتا رہا۔ پھر کہنے لگتا۔

”میں اپنی رجمنٹ میں سب سے کم عمر فوجی افسر تھا۔“
 ”ایک انگریز میجر نے مجھ سے اور میرے ساتھی گومیت سنگھ سے ایک بار امانت آمیز سلوک کیا تھا۔ میں نے اپنا پٹل گورے میجر کے سینے پر تان دیا تھا لیکن گومیت سنگھ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پٹل فائر ہوا اور گولی زمین کے سینے میں دھنس گئی۔ ورنہ بلڈی باسٹرڈ (BLOODY BASTARD) کے پرچے اڑ جاتے۔ اور پتھیں پتہ ہے یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ صرف میری شہیدا کے لیے۔ شہبا جس نے زندگی کی صعوبتوں میں میرا ساتھ دیا۔ شہبا جو ہر صبح

سے شام تک سنگاپور میں جا پائیوں کی قید سے میری رہائی کی منتظر رہی۔
میری شیبہ کی اس کیسے انگریز میجر نے بے حرمی کی تھی۔ بڑی تذلیل کی تھی اس
کی۔ اتنی کہ خود اس کی قوم کے سپاہیوں نے اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار
کیا تھا اور۔ ہاں، واقعی تصویر میری شیبہ کا بالکل نہیں تھا۔
اس کی زبان دوسری بوتل کے آغاذ پر پیچنی کی طرح حسب دستور چل
رہی تھی۔

”کون تھی یہ شیبہ۔ نام بڑا خوبصورت ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”شیبہ۔ شی۔ یا۔ سسی۔ یا۔“ مسعود نے دو ایک بار اسی طرح
اس کا نام لیا۔ پھر۔ کہنے لگا۔ ”میری کتیا، وفادار جانور۔ میری ڈارلنگ“
میں اسے بس دیکھتا رہ گیا۔ میں نے ایک صدف کا سینہ اس لیے داکیا
تھا کہ اس میں سے ایک درختہ نکل آئے گا۔ ایک گہرنا یا اب۔ لیکن شیبہ
تو کتیا نکلی۔

میراجی جانتا تھا کہ میں اس غلط فہمی کا شکار رہوں کہ شیبہ تو ایک
حمین و جمیل لڑکی ہے۔ ایک چلتا پھرتا جادو ہے۔ زندگی کی صعوبتوں
میں امید کی کون ہے۔ دل کی تاریکیوں میں موم بتی کا ننھا سا اجالا ہے۔
سرتاپا ایک ایسے حسن کا جیتا جاگتا وجود ہے۔ جس کے ہونٹوں سے ہونٹ
ملا کر مسعود اپنی اس زندگی کو بھول جاتا ہو گا جو ہر لمحہ موت سے نبرد آزما ہو جاتی
تھی۔

میراجی اب بھی یہی چاہا کہ اپنی بیٹی کو کتیا اور وفادار جانور کے نام سے

یاد کرنے کے اس انداز کو مسعود کی کوئی فوجی ادا سمجھوں — لیکن نہیں —
 شیبہ تو واقعی کتیا نکلی۔

” تو تم ایک جانور کے لیے ایک آدمی کی جان کے درپے ہو گئے تھے۔“
 ” بالکل نہیں — میں تو ایک عظیم عورت کے لیے ایک حیوان کی جان
 کے درپے ہو گیا تھا۔“

” کیا کہہ رہے ہو؟“

” سب کچھ بھیک کہہ رہا ہوں۔“

” شیبہ جانور تھی تو کیا ہوا۔ شیبہ کے اوصاف میں نے کم انسانوں میں
 دیکھے ہیں بلکہ کم عورتوں میں۔ اور اس نے بیر کاگ منہ سے لگاتے ہوئے
 کنکھیوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو کچھ ہی دور پر میری بیوی کے ساتھ
 خوش گیتوں میں مصروف تھی۔“

” تم یقین کرؤ شیبہ میری دوست تھی، میری ہمدرد، وہ ایک بہن
 تھی ایک ماں۔“

” کیا جانتے ہو؟“

” سچ کہتا ہوں — تم شیبہ کے دل تک کہاں پہنچ سکے ہو۔ صبر
 کرو میں تمہیں سب بتا دوں گا کہ وہ کیا تھی۔ میں اسے کیا سمجھتا تھا۔
 ” لیکن اس سور کے بچے نے اس لمبڑی باسٹرڈ گورے میجر نے اس کے
 ساتھ بہت برا سلوک کیا۔“

— وہ کہتا گیا۔۔۔۔۔

ہم نے جاپانیوں کے آگے ابھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ بارڈر پر کھدی ہوئی خندقوں کے اطراف پر لیشن لے کر ہی ہم نے ہینوں گمراہ دیے۔ نہ ہمیں پہل کرنے کا آؤر ملا تھا۔ نہ جاپانی ہی حملہ کرتے تھے۔ زندگی ایک عجیب سی بے دلی کا نام ہو گئی تھی۔ ایک ایسی کیفیت کا نام جو اپنے کسی پہلے کے یکے کھن بھاڑے جانے کی آواز سن کر ہوتی ہے۔ حالانکہ کسی بھی لباس کے لیے کپڑا بھاڑا جائے تو آواز مختلف نہیں ہوتی۔ بالکل وہی آواز ہوتی ہے۔ لیکن۔۔۔ بس کچھ یہی حال زندگی کا تھا۔ سب کچھ وہی تھا، وہی زمین، وہی آسمان، وہی چاند، وہی ستارے، وہی ان کی ٹھنڈک، وہی سورج، وہی اس کی تمازت، وہی صبح، وہی شام، لیکن پھٹتے ہوئے کپڑے کی آواز کا تاثر بدل گیا تھا۔ پھر یہی تاثر جیسے ختم کر، ٹھہر کر مستقل طور پر زندگی بن گیا تھا۔

”خوب رو لینے سے آدمی کا دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن رو لینا بس میں بھی تو ہو۔ کیا یہ کوئی مذاق ہے۔ اور شیبہ زندگی کے اسی دوڑ میں مجھ سے ملی جب کہ آفومیرے بس میں نہیں تھے۔ میں تو یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اگر یہ زندگی ہے تو موت کیا ہے۔ موت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔“

”موت اور زندگی کے اسی دورا ہے پر شیبہ مجھ سے ملی۔ بھوک کی شیبہ جس کو میں نے اپنے راشن میں سے برابر کا حصہ دار بنالیا۔ پھر وہ میری دوست ہو گئی۔ میری غموں اور۔۔۔ جہاں کوئی کسی کو نہیں دیکھتا ہو وہاں

کسی بھی ذی روح کا اپنی ذات میں دھپسی لینا۔ چاؤ اور چاست سے
 پیش آنا کتنی بڑی دولت ہوتی ہے اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہاں
 یہ تفریق مٹ جاتی ہے کہ تمہیں چاہنے والا کوئی انسان نہیں ہے جانور ہے۔
 ”تم نے زندگی کے وہ منظر دیکھے ہی نہیں، جہاں آدمی اور جانور میں
 تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور جہاں نہ کوئی آدمی، آدمی ہوتا ہے اور نہ
 جانور جانور۔

”میں اپنی رجسٹر کے ساتھ مورچے پر جا کر اپنی برلین سنبھال لیتا
 تو شیبامیرے ساتھ ساتھ اس سرحد تک آتی جہاں تک آنے کی میں نے
 اس کو اجازت دے رکھی تھی۔ اس کے بعد میں اُسے واپس چلے جانے
 کے لیے کہتا۔ سرگوشی کے انداز میں۔ اس لیے کہ یہاں تیز سانس لینا
 بھی خطرے کا باعث ہوتا Go BACK SHEEDA اور شیبامیرے
 سے جدا ہو جاتی اور ہمیں زمین کے سینے سے چٹ کر رنگتا ہوا دکھتی رہی۔
 یہاں سے وہ سرحد شروع ہو جاتی تھی جہاں سے ہمیں وینگ کو
 مورچے تک پہنچنا ہوتا تھا۔ نظروں سے اوجھل ہونے تک خود بھی زمین
 سے ہماری طرح ہی چھٹی ہوئی شیبامیں دیکھتی رہتی۔ اور جب دوسری
 نصف شب کو میں کسی دوسرے کپتان کو چارج دے کر لوٹتا تو شیباجھے
 اس سرحد پر ملتی جہاں میں نے اس کو پھوڑا تھا۔ جو میں گھنٹے بغیر کچھ کھائے
 پئے شیبامیری منتظر رہتی۔ جب میں اس کے قریب پہنچتا تو وہ بے تحاشا ڈرتی
 ہوتی مجھ تک پہنچتی اور میرے قدموں میں لوٹنے لگتی۔ میرے بھاری بھرکم

بٹ چاٹنے لگتی۔ اچھل اچھل کر اپنے اگلے پیر اور اپنا منہ میرے سینے پر داتی، پھر میرے اطراف چکر لگاتی اور یہ سب کچھ وہ اپنے حلق سے ذرا سی آواز نکالے بغیر کر گزرتی جیسے وہ اچھی طرح جانتی ہو کہ یہاں ہر آہٹ خطرے کا پیش خیمہ ہے۔ اس کو اپنے قدموں کی چاب پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ اس محبت کے مظاہرے کے وقت لگتا وہ زمین پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ہوا میں معلق میرا طواف کر رہی ہے۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ کیمپ پہنچتے۔ میری رحمت پو پھٹنے سے پہلے واپس ہوتی تھی۔ اس لیے نصف شب کو مجھے تنہا واپس ہونا پڑا۔ خطرے کی سرحد سے نکلنے کے بعد میں تنہا رہتا اور یہاں سے شیدا رفیق سفر موبائی۔ کیمپ میں جب تک میں رہتا وہ میرے سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی۔ ادھر کچھ دنوں ایک گورا میجر اس پر بہت ملنفت تھا۔ پھلی اور پیمین کے ٹن کے ٹن وہ شیدا کی طرف بڑھا دیتا۔ وہ ٹن چپکے سے اٹھا لاتی اور میں (MESS) میں مجھے تلاش کوئی ہوتی میرے پاس آکر اطمینان سے کھانے لگتی۔ یہ میجر وہی بلڈی باسٹرڈ ہے جو میرے ٹیل کا نشانہ بنتے بنتے رہ گیا۔

اس کا خالی گک میں نے بیر سے بھر دیا تو مسعود نے مگ اٹھا کر اپنے دائیں گال سے لگا لیا پھر بائیں گال سے۔ پھر ہونٹوں سے لگا کر اس نے آدھا گک خالی کر دیا۔

”تو گویا تم رقابت کے جذبے کا شکار ہو گئے تھے“ میں نے شہ دیا۔

اس نے مگ میز پر رکھا نہیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ اپنی ہتھیلیوں کو ٹھنڈک پہنچاتا رہا۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیے بغیر کہنے لگا۔

”بالکل نہیں۔ رقابت کا سوال ہی نہیں تھا۔ کوئی شیبہ کا خیال رکھتا۔ اس سے اچھا سلوک کرتا تو مجھے سکون ہوتا۔ لیکن اس بلڈی باسٹرڈ نے شیبہ پر مظالم ڈھائے۔ ایسے مظالم جو ایک فوجی کے نہ صرف شایانِ شان نہیں ہونے بلکہ اس کو نظروں سے گزادیتے ہیں۔ ہم تو اپنے ہنستے دشمن سے بھی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتے۔ یہ ملٹری ڈسپلن کے خلاف ہے۔ چہ جائے کہ اپنی محبوبہ سے ایسا برتاؤ کیا جائے جس نے اس بلڈی باسٹرڈ کے جنسی جذبے کی تسکین کی۔ اس کو تکلیف سہہ کچھ بھی سکون بخشا۔ تھیں معلوم ہے؟ اس نے ایک شب شیبہ سے اپنا مسخہ کالا کیا۔

”رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے شیبہ کے کمرے کی آواز سنی۔ دہریے سے بلکٹ (کیمبل) پھینک کر میں اٹھا اور آواز کی طرف لپکا۔ سردی کوڑا کے کی پڑ رہی تھی۔ یہاں بھول گیا تھا کہ مجھے دتانی اور لانگ کوٹ پہن لینا چاہیے تھا۔ میں بہت جلد اُس کیمپ کے پاس پہنچ گیا جس میں شیبہ کراہ رہی تھی۔ سپاہی ڈھلتی ہوئی رات میں گہری نیند کا مزہ لوٹ رہے تھے۔ میں نے باسٹرڈ کے کیمپ کے داخلے پر پہنچ کر منت بھر کر توقف کیا۔ پھر کیمپ میں داخل ہو گیا۔ کیمپ کا اندرونی حصہ گڑھے میں جلتی ہوئی آگ کی وجہ سے بہت گرم تھا۔ باسٹرڈ شیبہ کے ساتھ شیبہ کے اگلے اور پچھلے پیر بندھے ہوئے تھے اور اس حوالی پلے نے اس کو اپنے ہاتھوں

میں اٹھا رکھا تھا۔ شبانے مجھے دیکھا نہیں۔ البتہ اس حرامی نے مجھے بڑی نشوونما سے دیکھا اور بڑے ہی تحکمانہ لہجے میں کہا "BE OUT"

"میں نے اتنے زمانے سے خود بھی فوج میں مجروح زندگی گزار رہی تھی۔ مجھے اس کا تو علم تھا کہ بہت سے سپاہی نسکین کے لیے غیر فطری انداز اپنا لیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک آدمہ سپاہی جو کم عمر اور خوب روہوتا وہ بہت سوکھا منظر نظر ہوتا۔ وہ اس سے لوٹ نہ بھی ہو پاتے تو اس کو پھیر کر اس کی گالیاں سن کر اس کی برہمی سے کہہ ہی لطف اٹھا لیتے اور اس کے ساتھ کھانے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے لیے ایک دوسرے سے ٹھکڑ پڑتے۔ وہ کسی پرہیزبان ہو جاتا تو رقیبوں کا گروہ کا گروہ اس سے جلنے لگتا۔ خود میری رجمنٹ کے ایک نو عمر سپاہی کے تعلق سے مجھے اس قبیل کے کئی قصے چکانے پڑتے۔ بات بالکل کھل کر تو میرے آگے نہیں آتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ کون مشوق ہے اس پر وہ زنگاری میں۔

"لیکن ٹھنڈے سے اس ٹھٹھری ہوئی رات میں کوئی برت کی باریک سی تھیں میرے جلنے ہوئے دماغ پر اس طرح دھک دے گا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے جب اس باسٹرو کے کیمپ میں اس کو اس عالم میں دیکھا تو غصہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا۔ ایک احساس شرم تھا۔ ایک ایسی ندامت تھی جس کی نہ میں کوئی توضیح کر سکتا ہوں نہ خود اپنے ان احساسات کی وجوہ جاننا ہوں۔ ندامت تو اس نطفہ قذیر کو ہونا چاہیے تھی۔ شرم تو اس بلڈی باسٹرو کو آنی چاہیے تھی۔

"میں سر ہٹھکاتے اپنے کیمپ میں لوٹ آیا اور رات کا باقی حصہ سو نہ سکا۔ صبح کیمپ سے باہر نکلا تو شبانے معمول کے مطابق نہایت ہی گرم جوشی سے میرا سواگت

کیا۔ وہ میرے پیروں پر لوٹنے لگی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار شیبہ سے ایک عجیب قسم کی بیزادگی محسوس کی۔ نہ اس سے ٹھٹھول کیا، نہ گھبلا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شیبہ سے اس قدر سردہری سے پیش آؤں۔ لیکن ایک خلیج سی اس کے اور میرے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ میری شیبہ جو میری موٹس تھی۔ میری غم خواہ تھی کسی مرد کے اس جذبے کی تسکین کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ اور جب مجھے شیبہ کے اس روپ کا احساس ہوا تو مجھے اس سے گھٹنے لگی۔

”کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ میری عدم توجہی پر بھی شیبہ کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ادھر اس انگریز میجر کا شیبہ پر التفات فزوں تر ہوتا گیا۔ پھلی اور پینر کے ٹن وہ اس کی طرف بڑھاتا تو بھی شیبہ اس کے قریب نہ جاتی۔ وہ خود قریب آنے کی کوشش کرتا تو شیبہ غرائی اور بھاگ جاتی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا تو میرا جی چاہتا کہ اس بے شرم باسٹرڈ کا منہ فوج دوں۔ پتہ نہیں اس کی غیرت کو کیا ہو گیا تھا کہ خجھ سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اُسے شرم نہیں آتی تھی۔ ادھر خود میرا یہ حال تھا کہ تنہائی میں بھی شیبہ کو میں نے آغوش میں لینا چھوڑ دیا تھا۔ اس سے قرب کا احساس میرے ذہن میں ایک بالکل نیا تصور لے آتا تھا جو آج تک کبھی بھی مجھ میں اور شیبہ میں وجہ رفاقت نہ ہو سکا تھا۔ اب یہی تصور شیبہ سے میری بیزادگی کا باعث تھا۔

”کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شیبہ میری اس بے اعتنائی کے احساس سے مجھ سے اور قریب ہونا چاہتی ہے۔ تاکہ میں اپنا یہ رویہ تبدیل کر دوں پُناچے

دہ اب کچھ زیادہ ہی میرے قریب رہنے لگی۔ ادھر ادھر باہر گھومنے پھرتے
کے لیے بھی کم ہی جاتی۔ معمول سے زیادہ ہی میرے پیروں کو چاٹ کر میرے
قدموں پر بوٹنے کی کوشش کرتی۔ پھر ترنگ میں آکر ہوا میں جست لگاتی اور
ٹیسڑھی ترنچیں سامنے کھلے میدان میں بھٹ بھاگتی اور پھر ایک دم رک کر
اسی طرح میری طرف لوٹ آتی۔ میری دلدادہی کرنے کی شبیہ کی اس ادا پر
مجھے ترس آتا اور میں اس کی محبتوں کا جواب چاؤ اور لاڈ سے دینے کے لیے باہن
ناخواستہ خود کو تیار کر بھی لیتا تو اس کو اپنی آغوش میں لے کر بھینچتا نہ گود ہی
میں اٹھاتا۔ بس ذرا سا اس کی پیٹھ سہلا کر اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھر کر اس کو
تھپک کر جیسے روتے ہوئے کے آنسو پونچھ دیتا۔ ایسے میں بھی جب کہ میں شبیہ سے
کچھ دلاڑ سے پیش آ رہا ہوتا اور اس بلڈی باسٹرو کی فطریہم پر پڑ جاتی تو مجھے
لگتا کہ اس کی بھوک کی آنکھیں کسی اور ہی جذبے سے شبیہ کے صحت مند جسم کو تنک
رہی ہیں۔ اس جسم کو جو بجلی کی سی تیزی سے میرا طواف کر رہا تھا مجھ پر چھا رہا
ہو رہا ہوتا۔ اس وقت اس حوامی میجر کی زہریلی مسکراہٹ میرے تن بدن میں
آگ سی لگا دینے کے لیے کافی ہوتی۔ وہ شبیہ کو بہت پوچھا کرتا سمجھنا کہ
قریب لانے کی کوشش کرتا لیکن شبیہ جیسے اس کے سامنے سے بھی خوف
کھاتی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے مسلسل دیکھا تھا کہ شبیہ، بلڈی باسٹرو کی سپنج
سے باہر تھکڑا جو اس پر التفات کرتا۔ چاؤ اور پیار کا برتاؤ کرتا۔ میرے آگے
سعادت مندی سے اپنی گودوں جھکا دینے والی شبیہ اس گودے بھر کے لیے

ایک ناقابلِ تسخیر شے بن گئی تھی۔

”میں جب نو رہے پر ہوتا تو شباسرحد پر میری منظر ہوتی۔ میں جب کیمپ میں ہوتا تو شباسرجیسے میرا سایہ بنی رہتی۔“

”ایک روز میں اپنے کیمپ میں سو کر اٹھا تو دن ڈھل رہا تھا۔ آج خلاف معمول اس وقت میری آنکھ کھل گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ پچھلی رات میرا جسم شدید بخار میں پھنکتا رہا تھا۔ آج بھی کچھ حرارت تھی اور طبیعت ٹری کسل مند تھی۔ اس کس پرسر کی عالم میں صحت جو اب دے دے تو آدمی کے احساسات بڑے لطیف اور نازک ہو جاتے ہیں لیکن اس نزاکت احساس کی عمر ٹری مختصر ہوتی ہے اور جب آدمی موت سے آنکھیں ملانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے سارے جذبے پہلے ہی مر چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی کی سادھی توانائیوں سمیت اس موت پر فتح پانے کا درپے ہے جو ان جذباتوں کے ساتھ زندگی کو بھی ہمیشہ کی نیند سلا دینا چاہتی ہے۔“

”میں اپنے جذبات کے کفنائے جانے کی یہ داستان یہاں شروع نہیں کر دوں گا۔ تم انتظار کرو، فی الوقت تو بس اتنا سمجھ لو کہ اس شام بھی جب کیمپ میں سو کر اٹھا تھا تو میرے بوجھل پیوٹوں میں میرے ناتمام خوابوں کی کرپیں کھٹک رہی تھیں۔ ان ناتمام خوابوں کی کرپیں بوجھل مکمل زندگی تھیں۔ میرے احساسات پر کوئی پتھر ڈکڑا ہوا تھا اور میں دل ہی دل میں اس لذتِ سنگ کو چھپائے بیٹھا تھا جو میری بیوی اور بچی کی باتیں نے مجھے بخشی تھیں۔“

”میں آنکھیں ملتا ہوا کیپ سے باہر آیا تو خلاوتِ توقعِ شیدا میرے
 سو اگت کو نہیں آئی۔ میں نے سوچا کہیں گھوم پھر رہی ہو گی۔“
 اس نے ہیر کا نگ خالی کرنے سے پہلے دو چار چٹکیاں لیں پھر کچھ اس طرح
 سے اپنے ہونٹ نگ کے کناروں سے لگائے۔ خیالوں ہی خیالوں میں کہیں
 دور چلا گیا جیسے اس نگ میں ہیر کی بجائے یادیں تیاں ہو کر رہ گئی ہوں۔ اور
 جب تصورات کی اس دنیا سے وہ لوٹ آیا تو نگ خالی ہو چکا تھا۔
 میں نے اس کا اور اپنا نگ بھر لیا۔

”آج غم اس طرح دل کا اساس بن گیا تھا کہ میں بھی خیالوں کی انجن اسی
 سے سجالینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مجھے ڈرتھا کہ روپڑوں کا تو دل کی یہ مایہ ناز
 انجن بھائیں بھائیں کرنے لگی اور پھر یہاں تباہی بولنے لگیں گے۔ خوب رویں
 تو بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے زندگی کی قیمت ہم نے ادا کر دی
 ہے، جیسے زندگی کا قرض ہم نے چکا دیا ہے۔ اور کوئی قرض اتر جائے تو ذہن
 کتنا ہلکا اچھلکا ہو جاتا ہے کتنا مطمئن، اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے قرض
 زندگی کو ادا کر لیا ہو۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں یہ قرض چکا دوں۔“
 ”لیکن اس وقت کم سے کم شیدا ہی مجھ سے پیار کرے۔“

”میں اس پیار کا طالب تھا۔“
 ”یہ ایک مجھے خیال آیا شیدا کس مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہو گئی۔“
 اسی بلڈی باسٹرڈ کا اسی نقطہ تندر کے کروتوت تو نہیں کچھ؟
 ایک ثانیہ میں یہ وہم یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ اور میں اس کے

کیمپ کی طرف چل پڑا۔

کیمپن ڈاکٹر گرومیت شکھ جس کا میں نے پہلے بھی نام لیا ہے (Mess) سے واپس لوٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے باسٹرو کے متعلق دریافت کیا تو گرومیت نے بتایا کہ وہ وہاں نہیں آیا۔

”میں اس کے کیمپ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا تو گرومیت کچھ تاڑ گیا۔ اس کو میری اور باسٹرو کی وجہ مخالفت معلوم تھی۔“

”اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں نے اس کو صرف اتنا بتایا کہ شیبہ غائب ہے۔ میرے تیور بدلے ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے گرومیت بھی میرے ساتھ ہو گیا۔ اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے اخلاقیات کو بالائے طاق رکھا اور دڑاتا ہوا باسٹرو کے کیمپ میں گھس گیا۔ گرومیت باہر ہی ٹھہر گیا۔“

”میں نے کیمپ میں پہنچ کر دیکھا کہ باسٹرو یونیفارم پہن رہا ہے اور نقص کے ٹین اس نے ابھی نہیں لگائے ہیں۔ شیبہ ایک گوشے میں پڑی ہے۔ اس کو بلیٹ سے کس دیا گیا تھا اور اس کے پچھلے دائیں پاؤں سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔“

”میں بغیر کچھ کہے شیبہ کی طرف لپکا۔ باسٹرو نے میرے انداز نظر سے جان لیا تھا کہ میں بہت برہم ہوں۔ اس نے مجھے بلا اجازت اس کے کیمپ میں داخل ہونے پر ٹوکا۔ میں نے پردانہ کی اور شیبہ پر بھج گیا۔ اس کا تازہ زخم دس رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پٹیل کی گولی سے شیبہ کو زخمی کیا گیا ہے۔ میں نے چرے کا تسمہ کھول کر اس کو آزاد کر دیا تو باسٹرو نے مجھے ہندوستانی غلام

کہہ کر مخاطب کیا۔

”شیبا میرے قدموں میں لوٹ رہی تھی، وہ درد کی شدت سے کراہ رہی تھی اور چلنے کے قابل نہ تھی۔ میں نے بھی اس کو گالی دی۔ بلڈی باسٹرڈ۔ اور لپک کر اس کے مقابل ہو گیا۔ میری بلند آواز سن کر گرمیت کیمپ میں داخل ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ قریب کر وہ بیچ بچاؤ کرتا میں نے باسٹرڈ کے ایک منگھڑ دیا تھا۔ اس نے بھی ایک لات لگائی اور میں نے ایک جھپکتے پٹل نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ گرمیت میرے ہاتھ کو اپنی مضبوط گرفت سے جھکانے دیتا تو شاید باسٹرڈ وہیں ڈھیر ہو گیا ہوتا۔“

”گرمیت نے ہم دونوں کو جدا کیا باسٹرڈ غصہ سے کانپ رہا تھا۔ وہ اس حادثہ کے لیے ذمہ دار طور پر قطعی تیار نہ تھا۔ برخلاف اس کے میں ہریات کے لیے تیار ہو کر اس کے کیمپ میں گھس آیا تھا۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی لیکن دکھاوے کے لیے گالیاں بکتا رہا۔ اس اطمینان میں کہ گرمیت اب مجھے اس کے قریب آنے نہ دے گا۔“

”گرمیت مجھے گھسیٹ کر باہر لے جانے لگا تو میں نے شیبہ کو گود میں اٹھالیا اور ایک بار پھر خشونت بھری نگاہوں سے پلٹ کر باسٹرڈ کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی غراتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے مزہ چکھائے گا۔“

”ڈاکٹر گرمیت نے کیمپ ہاسپٹل میں شیبہ کی مرہم پٹی کی۔ ہمیں یقین تھا کہ میرے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ محاذ

پر زندگی کی بیکانیت سے ویسے بھی میں اکتا چکا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ کرنا تھا والا تھا اس کے لیے میں تیار تھا۔ زندگی میں کون سی خوبصورتی رہ گئی تھی جس کے پھن جانے کا غم ہوتا۔ یہی ناکر لے دے کر ایک شیبائی تھی سو اس کا بھی یہ حشر ہو گیا تھا۔

”لیکن اسی رات جا پانیوں نے ہم پر زبردست حملہ کیا۔ ہمارے بہت سے ساتھی کام آئے اور جب ہم نے ہتھیار ڈال دیے تو ہمیں قید کر لیا گیا۔ کیپٹن ڈاکٹر گر میت سنگھ نے باسٹرو کی جان بچانی جب وہ ایک کھائی میں زخمی ہو کر اوندھا پڑا مسک رہا تھا۔

”شروع شروع میں تو ہم سے ایسا سلوک کیا گیا جو جانوروں سے بھی نہیں کیا جاتا۔ میں نے شیبائی کو آخری بار اس وقت دیکھا جب کہ مجھے ہتھکڑیوں کے غول میں لے جایا جا رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر زخم تھے۔ اس کی کھپلی ٹانگ پر باندھی ہوئی تھی کھل گئی تھی اور اس کے زخم سے مٹی ہوئی زمین پر اس کے ساتھ رینگ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میں ٹھہر گیا تو وہ گھسٹتی ہوئی مجھ تک پہنچی۔ میرے زخمی پیر جاٹے لیکن ایک جاپانی فوجی نے مجھے پیچھے سے دھکا دے کر آگے بڑھا دیا اور شیبائی کے ٹھوک لگا دی تو وہ کراہ کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنے جسم کا پھللا حصہ زمین پر ٹکائے اگلے دونوں پاؤں کے سہارے گھسٹتی ہوئی پھر اس سمت بڑھ رہی تھی جس سمت ہم قیدیوں کو لے جایا جا رہا تھا۔

”میں نے دیکھا باسٹرو کے سر پر پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی زخمی

کا بھر تھا لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ شیبیا کے برابر سے گزرنے لگا تو اس نے بھک کر بڑے جاؤ سے شیبیا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ شیبیا نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی لیکن کسی جاپانی فوجی نے بندوقی کے کندے سے شیبیا کے سر پر چوٹ لگائی تو وہ تڑپ اٹھی۔ زخمی باسٹروڈ نے اسی لمحے جاپانی فوجی کی ناک پر پوری قوت سے منگر جڑ دیا اور وہ لڑکھڑاکھ کر گر گیا۔ ایک شور مچا۔ جاپانی فاسخ فوجیوں نے اس اہانت کے جواب میں باسٹروڈ کو زد و کوب کیا، اور ہم قیدیوں کے اطراف بند دینیں تان لی گئیں۔ اور ہم سر جھکا کر آگے بڑھنے لگے۔

”دوسرے دن جب ہمیں راشن کی تقسیم کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو باسٹروڈ مجھ سے ملا۔ وہ میرے قریب آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”مختاری گوئی کا ش میرے سینے کے پار ہو جاتی۔ میں غلامی کے یہ دن دیکھنے کے لیے تو زندہ نہ رہتا۔ اس نے اپنے زخمی ہاتھوں سے میرے ہاتھ تھام لیے اور مجھ سے آبدیدہ ہو کر معافی مانگی۔ میں نے تمہیں غلام ہندوستانی کہا تھا۔ اس کا آنسو میرے ہاتھ کی پشت پر گرا اور اس زخم کو جھگو دیا جو اس سے ہاتھ پانی کے وقت مجھے لگا تھا۔“

”بائبلڈ ایک میں کا مشا جھو کو اس نے انٹے کو کالی مرچ اور مک سے چھوایا اور مجھ سے لینے کے لیے اصرار کیا۔

میں اس داستانِ پارینہ میں اتنا کھو گیا ہوں کہ مجھے یہ بھی نہیں یاد رہا کہ تم میرے گھر میں میری ہی مدارات کو رہے ہو۔“

اُس نے مجھے اشارہ کیا اور لگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا دیا۔ جب ہم نے غیر ختم کر لی تو اٹھ کر فرج سے ایک اور بائبل نکال لایا۔ میں نے دیکھا میری مسز اکیلی بیٹی اپنے نومولود کو دودھ پلا رہی تھی۔ کیپٹن مسعود الزماں زیدی بھی میری بیوی کو تنہا دیکھ کر بڑا غیر مطمئن سا تھا اس نے اپنی بیوی کو پکارا۔ میک، میک، — لیکن اس پیار بھری آواز کا کوئی جواب کہیں سے نہیں آیا تو وہ خاموش ہو رہا۔

میں نے دیکھا اپنے پھرے پر مسکراہٹ کی چاندنی چمک لینے کی اس نے اس طرح کوشش کی جیسے پونچھے تازہ قبر کو سورج کی کوئی کرنیں قبرستان بھر میں نمایاں کر دیتی ہیں۔

مجھے پھرے کی اس چاندنی میں دو دو تک تارکیاں نظر آئیں۔

ایسی تارکیاں جس میں سب کچھ کھو چکا ہو۔

قبر کی تارکیاں جو ڈھانکی جا رہی ہوں۔

قبر کی تارکیاں جو ڈھانک دی گئی ہوں۔

اور کیپٹن مسعود الزماں زیدی نے بیر کا بھرا ہوا لگ اپنے ہونٹوں

سے لگا لیا۔

وہ آدھا لگ چڑھا گیا تو مجھ سے کہنے لگا کہ میں جلدی سے پی جاؤں

تاکہ ہم مل جل کر کھانا کھا سکیں اور میری بیوی کی تنہائی ختم ہو۔

مجھے اب سمجھ میں آیا کہ مسعود الزماں زیدی کی چہیتی میک میری بیوی

کو تنہا چھوڑ کر کہیں جا چکی ہے جب کہ ہم سب اس کے جہان ہیں۔

”بھابی کہاں گئیں۔؟“ میں نے پوچھا۔

میری بیوی کو تنہا دیکھ کر ہی کیٹپن زیدی کے سینے میں گولی لگ چکی تھی۔
میرے اس سوال نے جیسے اس گولی کو کھینچ کر باہر نکال لیا اور کیٹپن زیدی
تڑپ کر رہ گیا۔

میں نے بھی بات نہیں بڑھائی۔ اپنی بیوی کو آواز دے کر اسی ٹیبل
پر بلا لیا۔ میں نے مختصر اس کو بتایا کہ زیدی اپنی محاذ کی زندگی کے بڑے
دعویٰ واقعات سن رہے ہیں۔

”کھانا ہمیں منگوا لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا۔“

اور زیدی نے ملازم کو آواز دی۔ پھر حکم دیا۔

میرے ذہن میں اب دور دور تک خدشا کے لیے کہیں جگہ نہیں تھی۔
اب تو زیدی کی چہیتی میکی میرے ذہن پر سٹھوڑے لگا رہی تھی لیکن
زیدی کو اس درد و کرب سے نکال لینے کے لیے میں اس کو اس کے گھر سے پھر محاذ
تک لے چلا۔

”ہاں تو پھر کیا ہوا؟“

”کیا کہہ رہا تھا میں؟“

”یہی کہ گورے بلڈی باسٹرڈ نے اپنے زخمی ہاتھوں سے تمھارے ہاتھ
تھام لیے اور آبدیدہ ہو کر معافی مانگی۔“

”دوسرے دن ہم قیدیوں کو ہمدی بٹالین کے مطابق مختلف کیمپیں
میں منتشر کر دیا گیا اور سختی سے پابند کر دیا گیا کہ ہم اپنے دوسرے ساتھیوں

سے نہ ملیں۔

”ہم دل کھول کر نہ کسی سے کچھ بول چھ سکتے تھے نہ آپس ہی میں بات کر سکتے تھے۔ سب میں رہ کر بھی ہم تنہا تنہا تھے۔ اس بے دلی کو دور کرنے کے لیے سگریٹ ہی ایک ساقط ہو سکتا تھا۔ سو وہ بھی میسر نہ تھا۔ کوئی جایانی سپاہی رحم کھا کر ایک آدھ سگریٹ پھینک دیتا تو کئی سپاہی ایک ایک کٹش لگا لیتے اور۔۔۔۔۔ ایک جلتا ہوا سگریٹ کتنوں ہی کی دجھوٹی کا باعث ہوتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میری حیثیت یہ گوارہ نہ کرتی۔

”مختلف انڈیا میں ہم سنتے رہتے، ہمیں ڈیو لے جایا جائے گا، ہمیں شوٹ کر دیا جائے گا، یہ بتانے کے لیے کہ ہم زندہ سلامت ہیں ہم سب قیدیوں کو ریڈیو سے ایک ایک نشر یہ کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔ یہ اپنی سلامتی کا پیام ہو گا۔ جو ہم اپنی بیوی بچوں کو اپنے عزیز واقارب کو دے سکیں گے۔

”جب ہم نے سہیا نہیں ڈالے تھے اور محاذ پر مصروف رہ رہے تھے تو ہمیں اپنے بچے کچھ اس طرح یاد آتے تھے جیسے کوئی آہستہ سے دل سے ہو کر گھر جاتا ہے لیکن جب سے ہم قید ہو گئے تھے کچھ ایسا عالم تھا جیسے دل ایک ویرانہ ہے جہاں خانہ بدوش یادوں کا ایک قافلہ ٹھہر رہا ہے۔ آگ جلتی ہے۔ آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور یہ قافلہ روانہ ہو جاتا ہے۔ اور ہم ٹھنڈی راکھ کو دل کے ویرانے میں ادھر ادھر اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

”یادوں کی اس اڑتی ہوئی راکھ میں مجھے شیا بھی نظر آتی۔

”اپنا پچھلا دمطر زین پر ٹکائے اگلے پیروں کے سہارے رنگیتی ہوئی شیا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

”کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آج بھی اپنی زندگی کو میں اسی طرح گھسیٹ رہا ہوں، جیسے شبا ان دونوں کو گھسیٹ رہی تھی۔

”میرا ذہن پھر مگی کی طرف منتقل ہوا لیکن میں نے اپنے ذہن سے اس کو اس طرح نکال دیا جیسے ابھی ابھی وہ خود ہمیں اپنے ہی گھر میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

قید ہوئے ہمیں تیسرا دن تھا۔ وہ کہتے لگا ”سارے قیدیوں کو کھلے میدان میں دھوپ کھلانے کے لیے لایا جا رہا تھا۔ پھر ہمارا طبی معائنہ ہونے والا تھا۔ یکا یک میری نظر گودے میں چر بڑی وہ اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے شبا پڑی تھی۔ خوشی مجھے اس طرح مل گئی جیسے کسی بھوکے فقیر کو راستے میں پڑا ہوا روپیہ مل جاتا ہے۔

”شبا زندہ ہے لیکن گورا میجر اس کے زخم سے کٹرے چُن کر نکال رہا تھا اور وہ اس کے زخمی پیروں کو چاٹ رہی تھی۔

”شس۔ باب۔ میں نے اس کو پکارا۔

”وہ اس طرح اٹھی جیسے دنیا بھر کی طاقتیں اس نے سمیٹ لی ہیں۔ اس کی کھوپڑی میں کسی کھوئی ہوئی چیز کے پا جانے کی مسرت بخش چمک تھی۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بے چینی سے میری متلاشی تھیں۔

”شبا۔ شس۔ باب۔

میں نے پھر پکارا۔

”اس نے تڑپ کر مجھے دیکھا اور شاید یہ بھول گئی کہ اس کا پنجا حصہ بیکار ہو

چکا ہے۔ اضطرابی کیفیت میں اس نے جیت لگائی اور وہیں گر پڑی۔ پھر اٹھی اور پوری قوت سے اپنا جسم گھسیٹی ہوئی میری طرف بڑھی۔

”کل سارے قیدی سائیکان لے جاتے جائیں گے۔ وہ لوگ جو ریڈیو پر اپنے بیوی بچوں کو کچھ پیام دینا چاہیں وہ اپنے نام نوٹ کر دیں۔

”لاؤڈ اسپیکر پر جا پانی میں بولتی ہوئی ایک آواز کا ترجمہ بھی ہمیں فوری بعد۔

سنایا جا رہا تھا۔ سب کے سب اس آواز کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میری آنکھیں شیدا کو تک رہی تھیں۔ میرے کان آواز کو سن رہے تھے۔ شیدا میری طرف بڑھ

رہی تھی۔ اس کا ادھر مراجم زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ وہ کراہ کر دم بھر کے لیے رکتی پھر پوری قوت سے میری طرف بڑھتی۔ میں خاردار لوہے کے تار کے احاطے

میں کھڑا شیدا کو اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھتا رہا۔ گھٹالے پر گونجتی ہوئی آواز کو مسترد رہا۔ کل مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔ شیدا کو اسی حالت میں چھوڑ کر۔

شیدا کو جو ادھر مرے جسم کے ساتھ میری تلاش میں یہاں تک چلی آئی ہے۔ شیدا کو جو میری آواز سن کر اپنے مرنے ہوئے جسم کی ساری تکلیفیں بھول چکی

ہے۔ شیدا تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔ اس کے جسم سے کیڑے چھنے والا گورا میجر بھی کل یہاں نہیں رہے گا۔ میں نے بے طرح پھرتی سے کام لیا۔ جا پانی پانی

کی کمر سے بندھا ہوا پٹل میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے کیا کہ وہ مزاحمت بھی نہ کر سکا اور میں نے پٹل کی ساری گولیاں شیدا کے

سینے میں داغ دیں۔ اور گولیوں کے بعد ہی پٹل خالی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا مجھے کوئی احساس نہ تھا اور میں خالی پٹل کی لمبلی دبائے جا رہا تھا۔ یہاں تک

کہ دوسرے سپاہی جمع ہو گئے اور انہوں نے پٹل مجھ سے چھین لیا۔
 ”گورامیجرتہ نہیں کب دوڑ کے میرے پاس آ گیا تھا۔ مجھے جب ہوش
 آیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے بھنبھوڑ رہا ہے۔

”میں نے نڈھال ہو کر اس کے سینہ پر اپنا سر رکھ دیا اور اس سے پہلے کہ
 میں رو پڑوں۔ گورامیجرتہ دوڑ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم اگر یہ سب کچھ نہ کرتے
 تو میں یہی کر گزرتا۔ ہم اپنے کسی چہتے کی زندگی کو اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتے کہ موت
 اس کا نسخہ اڑائے۔

”لیکن مجھے گورے میجرتہ پر اس کے آنسوؤں کے باوجود رحم نہیں آیا۔
 میں نے اس سے کہا تم چلے جاؤ۔ خدا کے لیے تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔
 اور وہ آنسو پونچھتا ہوا کہیں کھک گیا۔ اس کے بعد میں نے اس کو پھر نہیں دیکھا۔
 لیکن وہ مجھے یاد آتا ہے۔

”سیام پر بھی جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس لیے ہم کو Saigon لے
 جایا گیا۔ جہاں سے میں نے ریڈیو پر مائیک کے سامنے صرف اتنا کہا کہ ”میسکی
 میں جب لوٹ آؤں گا تو تمہیں شیبہ پکاروں گا۔“

بتہ نہیں میکی نے میری یہ آواز سنی یا نہیں۔ لیکن جب میں لوٹ آیا
 تو میں میکی کو آج تک شیبہ نہیں پکار سکا ہوں۔ آج تک نہیں۔ میں اس کو
 کس طرح شیبہ کے نام سے پکار سکتا ہوں؟“

اس کے بعد مسعود الزماں زیدی بالکل خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر
 بڑھاپا چھا گیا تھا۔ وہ شگفتہ چہرہ جس سے میں ابھی کچھ دیر پہلے اس کے اسی گھر میں

ملا تھا وہ میرے سامنے نہیں تھا۔

میں نے اس سے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا تو میں نے مصافحہ کیا۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے۔

اس نے بہت جھک کر میری بیوی کو الوداع کہا لیکن اس سے نظر میں چار نہیں کیں۔ ہم سیڑھیاں اتر کر پورے ٹیکہ تک پہنچے تو ایک موٹر آکر روکا۔ سیکیٹر سے جاؤں کسی نوجوان کو الوداع کرتی ہوئی اتری۔

موٹر کی ہینڈلائٹس آٹ ہوئیں تو میں نے دیکھا۔ یہ جوان مسعود الزماں کا کوئی دوست تھا جس سے میں کچھ سن مسود کے گھر میں ہی متعارف ہو چکا تھا۔ میں نے مسود کو خدا حافظ کہا اور اپنی کار اسٹارٹ کرنے ہی کو تھا کہ گھر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔

کمیٹن مسود الزماں زیدی بے قرار ہوا اٹھا۔ اس نے جلا کر کہا۔
 ”شیدا آ رہا ہوں۔ شیدا ڈار بنگ“ اور مزید انتظار کیے بغیر وہ پک کر اپنے گھر میں جا گھا۔

میں نے ہاتھ ہلا کر ہم کو الوداع کرتے ہوئے کہا۔ ”شیدا ساری بچی ہے، مسود اس کے دیوانے ہیں وہ خود بھی ایک لمحہ انھیں نہیں چھوڑتی۔ وہ سو رہی تھی، جاگ گئی ہے شاید۔“

میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے کی لائٹ جلائی تو پورے ٹیکہ منور ہو گیا۔ کاش میں کمیٹن مسود الزماں زیدی کی تاریک زندگی میں روشنی کی کوئی کرن پھینک سکتا۔

کاش میں دنیا بھر کی محبتیں ٹپور کر ایک لمحے کے لیے اس کے خال
بھری ہو سکتا۔

صرف ایک لمحے کے لیے۔
تیری کاش تم شیدا ہو سکتیں۔
اور میں نے کار بڑھا دی۔

رات کے راہی

کھٹ، کھٹ، کھٹ

باکئی سے گزر کر وہ اس طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھتی جیسے اپنے ہی سائے سے بچ رہی ہو۔ اور سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے اس کا سایہ بھی چپکے سے اس کو چھوڑ کر دیوار کی اوٹ میں اس طرح جا چھپتا جیسے اس کی واپسی پر اس کی ساری ڈھکی بھپی تپناؤں، دبے دبے جڑبوں، سہمی سہمی خوشیوں سمیت اس کو دبوچ لے گا۔

وہ چوروں کی طرح چپکے سے باکئی سے گزر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھتی تو اس کا سایہ اس کو چھوڑ کر نیچے ہٹ آتا کیونکہ سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے اندھیرے کچھ اور بڑھ جاتے اور سایہ صرف اجالے کا ساتھی ہے۔

وہ دروازہ کھولتی اور لمحے بھر کے لیے سڑک کی آواز رہ روشنی کرن کرن
 بن کر اس طرح اس کے دروازے میں در آتی جیسے سینے میں راز ہائے سرسبز۔
 اور پھر دو مضبوط باہیں اس کے سارے وجود کو جکڑ لیتی ہیں۔ پھر اس
 کا جسم اپنی ساری حرارتیں، اپنے سارے احساسات، اپنی ساری یکجہرتا کو
 ایک ہی مرکز پر سمیٹ کر اپنا سب کچھ اُن دونوں کھلے ہوئے ہونٹوں کو سچ دیتا
 جو تیزی سے اس کے اپنے پیاسے ہونٹوں کی طرف بڑھتے۔

وہ تڑپ کر اس کی باہنوں سے لمحے بھر کے لیے نکلتی۔ دروازہ بند کر دیتی
 اور دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیے سیڑھیوں پر چڑھ کر بالکنی میں داخل
 ہو جاتے۔ آہستہ آہستہ پیرد باکر اس محتاط خرامی کے باوصف جاوید لڑکھڑاتا
 تو ذکیہ اسے سنبھال سنبھال لیتی۔

لیکن ذکیہ کا سایہ اب ایک اور مضبوط و توانا سائے کے ہاتھوں مجبور
 محض بنا رہتا۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

بالکنی سے گزر کر وہ اس طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھتی جیسے اپنے
 ہی سائے سے بچ رہی ہو۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

بالکنی سے گزر کر

اور یہ اس کا روز ہی کا معمول تھا۔

بالکنی سے لگا ہوا جاوید کے والد کا کمرہ تھا۔ جاوید کا والد شدید

ذیابیطس کا شکار تھا۔ بیٹھا بیٹھا چکر اجاتا۔ بعض وقت آنکھیں پھاڑ
 پھاڑ کر اجالے میں اس طرح گھورتا جیسے اندھیرے میں سمجھائی نہیں
 رہا ہو۔ بعض وقت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اجالے میں اس طرح گھورتا
 جیسے اندھیرے میں سمجھائی نہیں دے رہا ہو۔ بعض وقت پڑا پڑا دیکھتا
 رہتا۔ اس کی سادی قوتیں بس سمٹ سمٹا کر اس کی زبان میں سمجھ ہو گئی تھیں
 ایک پل بھی ضائع نہ کرتا اور فوراً باتیں شروع کر دیتا۔ کوئی ضروری بات نہیں کہ
 جس سے باتیں کر رہا ہو وہ چار پانچ برس کا بچہ یا بچی نہ ہو۔ یہ بھی ضروری
 نہیں کہ جس آدمی سے باتیں ہو رہی ہوں اس کی اپنی بیوی پاس ہی کہیں در
 نہ سے چلا نہیں رہی ہو۔ نہ عمر کی قید، نہ موقع محل کی تخصیص۔ جو ملے،
 جہاں ملے، جس عالم میں ملے۔ جاوید کے والد اپنی زبان قینچی کی طرح چلانے لگتے۔
 اور کہتے ہی نازک لٹخوں پر یہ زبان اپنا عمل جراحی کو دیتی اور وقت زخمی پرندے
 کی طرح اس کے آگے پھر پھڑاتا۔

یہی وجہ تھی کہ ذکیہ اپنے چاہنے والے شوہر کے انتظار میں جب بے کل
 ہو جاتی تو اس طرح سانس روکے پڑتی رہتی جیسے جاوید کا باپ اس کی تیز تیز سانسوں
 سے یہ اندازہ لگالے گا کہ ذکیہ جاگ رہی ہے۔ پھر وہ اس کو پکارے گا۔
 ذکیہ۔ ذکی مٹی۔ دد گھونٹ پانی۔

اور جب ذکیہ پانی پلانے کے جوہر میں کپڑی جائے گی تو یہی پانی اس کے
 دل و دماغ میں زہر بن کر اتارنے لگے گا۔ یہاں تک کہ وہ پاگل ہو کر تیج پڑے
 گی۔ "ابا تم بہت جی چکے ہو۔ اب مر بھی جاؤ۔"

”ابا، میں اپنے جاوید کا انتظار کر رہی ہوں۔ تمہارے بیٹے کا۔ میرے
اپنے شوہر کا اور تم مجھے اس انتظار کی لذت سے چھٹے رہنے دو۔
”ابا، اب وہ آئے گا اور اس کی بائیں، اس کے
”اُم ابّا، تم اپنی موت کے تعلق سے کتنے غیر سنجیدہ ہو۔
”تم تو اس طرح جی رہے ہو جیسے کوئی بولا گنا کھاتا یا گنجھٹیل میدان میں
اپنی چند یا کوادلوں سے بچاتا ہو۔“
کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

وہ بے تحاشہ جاوید کے لیے بھاگتی لیکن بالکنی تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے
ہی سائے سے خوف کھانے لگتی۔ اس لیے کہ وہ بچ بچ کو سیرھیوں تک پہنچنا
چاہتی تو اس کا سایہ ابا کے کھلے ہوئے دروازے کی چوکھٹ کو بوسہ دیتا ہو اگر نہ
اور اگر ابا جاگتا رہتا تو اس سائے ہی کی سازش ذکیہ کی گونٹاری کا باعث بنتی۔
کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تو بڈھا اپنی بہو اور بیٹے کو اس وقت تک وق
کر تا جب تک کہ وہ سرکشی پر نہ اتر آتے۔ اس وقت ان کی زندگی کی سب سے
بڑی تمنا ان کی اپنی خلوت ہوتی۔

خلوت جو دو جسموں اور دو حووں کا اتصال بن دووں کے نس نس میں
سما جاتی۔

اور اس وقت ابا اپنے بے مصرت دجو دکا بوجھ اٹھاتے ان کی پھولوں
بھری رنگین خلوت میں بوریت کے کانٹے پھیننے کے لیے کبھی کبھی جاگ جاتا۔
اسی لیے ذکیہ بالکنی سے گزر کر اس طرح سیرھیوں کی جانب بڑھتی جیسے

اپنے ہی سائے سے بچ رہی ہو۔

لیکن ایک زخم تھا جو اتنی ساری محبتوں کے باوجود۔ اس بے پناہ سپردگی کے باوجود ذکیہ کے سینے میں کہیں رس رہا تھا۔

ایک ایسا زخم جو محبتوں کی حفاظت کئے لیے اپنی ذمہ نرم خنڈش کے ساتھ دل کے قریب ہی کہیں چپکے سے نمودار ہو جاتا ہے۔

جیسے کوئی پھولوں کو سل رہا ہو۔

جیسے کوئی گھنے سالیوں کی ٹھنڈی نقلا میں اٹھارے پھینک رہا ہو۔
جیسے کوئی اپنے بیٹے کی قبر پر سر جھکا کر بیٹھا دور سے آتی ہوئی نانا تو کی آواز سن رہا ہو۔

حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہوتا لیکن احساسات کچھ نہ ہونے کو بھی تو محسوس کرتے ہیں۔

اور اپنی زندگی سے مطمئن ہونے کے باوجود ذکیہ کسی ایسی ہی خوش سے دوچار ہو گئی تھی۔

”ذکیہ کا جاوید تو بڑا شرابی ہے“

”جاوید بڑا ذہین اور اچھا دوست ہے جو شراب کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔“

”اس کے لیے دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیار ہی شے شراب ہو“
”اس کے بعد ذکیہ!“
”نہیں“

”ذکیہ کے بعد شراب کہو۔“

”بجو اس ہے۔“

”پہلے شراب۔“

”نہیں جی، پہلے ذکیہ۔“

تم ہی بتاؤ کہ ذکیہ۔ جاوید کے دوست ذکیہ ہی سے پوچھ بیٹھے۔ وہ مسکرا مسکرا کر جاوید کو دیکھتی اور جاوید جا ہی لے کر کھڑا ہو جاتا۔ جیسے سب کے سب بجو اس کو رہے ہوں لیکن پھر بھی وہ ذکیہ کا ہاتھ دبا کر آہستہ سے اس سے کہتا۔

تم مجھے شراب سے زیادہ عزیز ہو۔ اس لیے کہ تم خود شراب ہو۔ اور وہ مسکرا کر جاوید کو دیکھتی رہ جاتی۔

لیکن ایک زخم تھا جو اس کے سینے میں کہیں رس رہا تھا۔

”جاوید شرابی ہے“ جاوید شرابی ہے۔
”جو زندگی کا سارا حسن شراب کے لیے ٹھکرا سکتا ہے۔“
”جو ذکیہ کو

— اور ذکیہ نے ایک رات جاوید کے پاؤں آنسوؤں سے دھو دیے۔

”شراب بھوڑ دو جاوید۔ شراب میری خاطر بھوڑ دو جاوید۔ میرے لیے بھوڑ دو۔“

لیکن آدمی کبھی کبھی وقت کے ہاتھوں سے کیا کچھ نہ چھین کر قیمت کی جھولی میں پھینک دیتا ہے۔ صرف اس تصور میں کہ وہ نیکی کی طرف جا رہا ہو۔

حالانکہ ایک وقت کی کھلے دل کی مسکراہٹ سب سے بڑی نیکی ہے۔

جاوید نے ذکیہ کو اپنے قدموں سے بڑے چاؤ سے اٹھایا اور جب اس کے ہونٹ اس کی آنکھوں سے جدا ہوئے تو زبان پر شراب کی تلخی کے ساتھ آنسوؤں کا نمک بھی تھا۔

اور پھر ذکیہ کے جسم کے روئیں روئیں سے پھوٹتے ہوئے سرسبز شراب آہستہ آہستہ بھول بن کر کھلنے لگتے۔

اور ذکیہ کو جاوید کے اس وجود کے سوا کچھ بھی یاد نہ رہا جو پیاسی کھیتی پر متوالے بادل کی طرح جھوم جھوم کر چھا رہا تھا۔
اور جاوید نے شراب نہیں چھوڑی۔
کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

اور یہ اس کا روز ہی کا معمول تھا۔

جاوید ایک پرائیویٹ فرم میں اسٹنٹ منیجر تھا۔ دن بھر بڑی محنت اور لگن سے کام کرتا اس کی زندگی ایک بندھا ٹکاپر و گرام تھی جس میں ایسی یکسانیت آگئی تھی جو بجائے خود زندگی کا ایک شبنم بن کر رہ گئی تھی۔

رات کا متوالا جاوید صبح پو پھٹتے وقت بیدار ہوتا۔ آنکھوں میں سُرخ و دروں کے سوا کوئی اور علامت نہ ہوتی جو رات کا راز کھلائی جاسکے۔
ذکیہ ابھی تک سوئی رہتی۔ جاوید شیو کرتا اور غسل خانے میں گھس جاتا۔
اور جب وہ نہادھو کر دھان پان سائیسٹی بجاتا ہوا غسل نہانے سے نکلتا تو
ذکیہ جاہیاں لیتی ہوئی، انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی اور اپنے کپڑوں

کو درست کرتی ہوئی بستر سے پھلانگ لگا کر اس چھپا کے سے غسل خانے میں گھس جاتی جیسے اپنے بدن کی رعنائی جاوید کی تیز تیز نگاہوں سے بچا رہی ہو۔ وہ دیر تک نہاتی رہتی۔ اپنے جسم کو پانی کے چھپا کوں سے کچھ اس طرح تھم تھم کر کھنڈک پہنچاتی جیسے کوئی راکھ میں دی ہوئی پنکھاریوں پر پھینٹے دے رہا ہو۔ وہ دھیمے سُروں میں جوانی اور بہاروں کے گیت گاتی۔ ایسے گیت جو ہمارے شاعروں نے اکہلی نہیں لکھے ہیں۔ ترنگ میں ہونے سے اس کی آواز کبھی تیز ہو جاتی تو جاوید سن کر آپ ہی آپ خوش ہوتا۔ کبھی ان آوازوں سے وہ خود اتنا ترنگ میں آجاتا کہ اٹھ کر غسل خانے کے دروازے کو کھٹکھٹانے لگتا۔

”جان من جلدی کرو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

ذکیہ اس کی آواز سن کر کھنٹی اور اونچے سروں میں گانے لگتی۔

کبھی بیٹ سے دروازہ کھول کر سامنے آجاتی تو جاوید اس کے کھرے ہونے حسن کو دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا۔

کبھی وہ ”تاک“ کرتا۔ اور ذکیہ انداز سے پکارتی۔

”تم نے اخبار اتنا جلد پڑھ لیا؟“

”ہاں جان ایک ایک لفظ پڑھ لیا ہے۔“

”آ رہی ہوں۔“

”ابھی آجاؤ ذکی۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

پھر دونوں مل کر میز پر دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے۔ بڑھا اپنے کمرے میں کبھی کبھی سانس لے کر اپنے زندہ وجود کا احساس انھیں دلا دیتا۔ کبھی کبھی

اس کی آواز ذکیہ اور جاوید کے کانوں سے اس طرح مکرراتی جیسے کوئی آہستہ خرام موج ساحل کو ہلکے ہلکے جھو رہی ہو۔ وہ ناشتہ کرنے کے دوران میں کبھی باورچی سے کبھی بھارڈو لگانے والے لونڈے سے باتیں کیے جاتا۔ ذکیہ اور جاوید کو اس بات کا احساس تھا یا کبھی کہ باورچی یہاں رہتا تو پانی کے لیے یا مشکریا دو دھ کے لیے انھیں اپنی جگہ سے اٹھنا پڑتا لیکن بوڑھے بابا کی آواز مسلسل آتی رہتی جو باورچی سے باتیں کر رہا ہوتا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ذکیہ سنگار میز پر رکھی ہوئی خوشبوؤں سے جاوید کے کپڑوں کو معطر کرتی۔ اپنے ہاتھ جاوید کے کپڑوں پر پھیرتے وقت یہ بات صاف صاف طور پر اس کے سمجھ میں آ جاتی کہ جاوید کے لیے اس کا پیارا اس کے ہاتھوں میں سمٹ آیا ہے۔ کپڑوں پر وہ اس طرح خوشبو ملتی جیسے وہ اپنے آپ کو ہی منوار رہی ہے۔

جاوید سچ و جج کر آفس کے لیے تیار ہو جاتا تو وہ ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے دروازے تک جاتے۔ ذکیہ بڑی محبت سے جاوید کے ہاتھ دباتی۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ بالکنی سے ہو کر دروازے تک پہنچنے سے پہلے بابا جیسے راتنے ہی میں انھیں لوٹ لیتا۔

”جاو — جاو —“

”ہم آہی رہے تھے بابا“

”میں کہتیں کہنے والا تھا کہ ڈاکٹر نے مجھے صرف سفید گوشت کھانے کے

لیے۔“

”میں آج پھل بھی اداں گا ابا۔ یا پھر آپ کہیں تو مرغ، یا پرانس“

”پرائس ٹھیک رہیں گے۔ پرائس بالکل ٹھیک رہیں گے۔“
 ”لیکن جادید، مجھ سے کھایا نہیں جا۔“ کچھ — پرسوں میں نے تھوڑی
 سی پڑنگ کھالی تھی اور ”شوگو“ بڑھ گئی تھی۔ رات بھر میں سو نہ سکا۔ تم اس
 رات بھی حسب معمول دیر سے لوٹے لیکن مجھے پتہ نہیں ذکیہ نے کب دروازہ
 کھولا۔ تمہارے لیے دروازہ کھولنے کے لیے صرف وہ چوروں کی طرح پھپ
 پھپ کر جاتی ہے کہ کہیں میں جاگ نہ جاؤں۔ ذکیہ میرا بہت خیال رکھتی ہے
 جادو — وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم اسے کبھی تکلیف نہ پہنچانا۔ میرے مرنے
 کے بعد بھی نہیں — لیکن تم میرے لیے پرائس ضرور بھیجنا، کیونکہ ڈاکٹر نے
 مجھے سفید گوشت —“

”ہاں ابا — میں آپ کے لیے پرائس ضرور بھیجوں گا۔“
 ”میں کل رات بالکل نہ سو سکا۔ میں نے جام کاٹن صرف سو گھنے اور
 اس کا رنگ دیکھنے کے لیے منگوایا تھا۔ لیکن باورچی نے مجھ سے کہا کہ وہ بہت
 مزیدار ہے اور میں نے چکھا — بہت تھوڑا سا — چچہ، دوپچے، تین چچے
 — پر اس سے کیا ہوتا ہے — چھ چچے ہوں بھی تو کیا ہوتا ہے۔ لیکن
 مجھے فینہ نہیں آئی۔ اور اب بھی مجھے چکر سا آ رہا ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس
 پھر جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ اس سے کہہ دوں گا۔ اسے یہی کہہ دوں گا
 کہ — ہاں مگر تم پرائس میرے لیے ضرور بھیجنا۔“
 ”ہاں ابا ضرور ضرور —“ اور جادید ”جادید ذکیہ کے ساتھ کمرے سے
 باہر نکل جاتا۔“

بڑھا اب بھی باتیں کیے جاتا۔ وہ پکار کر ذکیہ سے کہتا۔ جاو جا چکے تو تم ادھر ہوتی جانا۔ ذکیہ کبھی سنی آن سنی کر دیتی۔ کبھی کہتی ضرور آؤں گی۔ لیکن وہ کبھی بڑھے کے پاس نہ پھٹکتی۔ سچ پوچھیے تو بڑھا ذکیہ سے کچھ ایسا خوش بھی نہ تھا۔ جاوید کے سامنے ذکیہ کی تعریفیں وہ کرتا بھی تو ان تعریفوں میں مصیحتیں بھی ہوتیں۔ کیونکہ اباجانت تھا کہ ذکیہ کی غیبت اور شکایت سے اٹے خود اس کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے کئی بار اپنے پیسے کو دیکھا تھا کہ وہ ذخیرہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ محبت کی اس فضا میں آبا کے بغض و عناد کے کانٹوں کا بار آور ہونا مشکل تھا۔

جاوید چلا جاتا تو اس کے لپٹنے تک ذکیہ کو اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں بڑی کمی محسوس ہوتی۔ وہ کچھ دیر کے لیے اداس ہو جاتی۔ ہر چیز قرینہ سے اپنی اپنی جگہ دھری رہتی لیکن ذکیہ کو اس طرح الجھن سی ہونے لگتی جیسے گھر کا قرینہ نہیں نہیں ہو گیا ہو۔

اس کا عادی تنہائی کا یہ عزم جاوید کی شراب نوشی کے خیال سے ایک کمرے درمیں بدل جاتا۔ وہ سوچتی کہ اسی شراب کے باعث وہ روزانہ کھلتا ہے۔ آفس کے اوقات کے بعد کئی گھنٹوں تک اسی شراب کی وجہ سے جاوید سے اس کو جدار ہٹا پڑتا ہے۔ اور وہ جاوید کے ساتھ شام کی تفریح کے لیے ترس ترس جاتی ہے۔ اس کی سہیلیاں اس سے کوید کوید کر پوچھتی ہیں۔ کوئی اس طرح ہموردی دکھاتی ہے جیسے اس کی اپنی زندگی سے بھی جاوید کا کوئی واسطہ ہے۔ ادھر یہ ساری باتیں اسے بہت کھلیتیں جیسے کالونی بھر کے لوگوں کا بس

یہی کام رہ گیا تھا کہ اس کے زخموں کے یا تو لب سئیں یا پھر ناک چھڑکیں۔ میں جس کسی کا جی چاہتا وہی غم خوار ہو جاتا۔

جب جاوید رات گئے آتا تو وہ بالکل کوئی بات ہی نہ کرتا۔ اس کی زبان بالکل کوئی بات ہی نہ کرتا۔ اس کی زبان بالکل خاموشی سی اس کے ہاتھوں کی حرکات و سکنات کا تماشہ کرتی ہے۔ صبح کو بڑی نرمی سے ہاتھوں کو چوم کر جدا ہونے والا جاوید، رات گئے کیف و سرور کی ایک دنیا لیے ہوئے آتا اور ذکیہ کی زندگی کو راحتیں دے دیتا۔ ایسی راحتیں جن کی جوڑیں زندگی میں بڑی مقبوضی سے دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اندر ہی اندر جو سطح سے نظر نہیں آتا۔

بعض پاگل ان راحتوں کو جذبہ حیوانی کا نام بھی دیتے ہیں اور محبت تقدس کا بہرہ و عطا کر کے خوش بھی ہوتے ہیں۔ لیکن دن بھر جاوید کے لیے بے کل رہنے کے بعد رات کو ذکیہ آئینے کے سامنے پہنچتی تو اپنے سن کو سو سو طرح سنوار کر خوش ہوتی اور تصور ہی تصور میں جاوید اس کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتا تو صرف اس کی روح نہیں اس کے جسم کا رواں رواں اس کھٹ کھٹ کا منتظر ہوتا جو ابھی دروازے پر ہوا چاہتی ہے۔

دن بھر گھر کے کام کا ج میں ذکیہ کا دل بہل ہی جاتا۔ کبھی اپنے اور جاوید کے لیے وہ سویٹر بنتی۔ کبھی بڑھے ابا کے پرانے سویٹر کو رفر فر دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتی۔ جاوید کے لیے وہ روز ہی اپنے ہاتھ سے لیچ تیار کرتی اور بڑے چاؤ سے، بڑے جتن سے ہاٹ کیس میں رکھ کر اس کے لیے بھجواتی۔ لیچ کے ساتھ کبھی کبھی وہ اسے ایک دو حرف لکھ بھی دیتی۔

کب آؤ گے، میں تو بس تمہارا انتظار بن کر رہ گئی ہوں —
 مجھے لکھنا کہ آج میں نے بال کوی کیسی بنائی ہے —
 کیا تمہیں لہجہ پر میری یاد نہیں آتی — تمہارے اتنے بہت سارے
 دوست جو ہیں۔ بچوں یاد آؤں گی میں —

پڑوس والی بیجاری دیکھا چل بسی۔ جی بے سبب اداس ہو گیا ہے۔ تم
 ہوتے تو تمہاری باتیں اس گھٹن میں ہوا کے تازہ جھونکوں سے بڑھ کو تازہ کیا
 عطا کرتیں۔

آج کھانا بھجوانے میں اکیس منٹ کی دیر ہو گئی — تم مجھے معاف
 کر دو گے نا۔ تصور دار تمہارا ملازم ہے —
 آج تم آفس سے سیدھے ادھر چلے آنا۔ تمہارے ساتھ گھومنے کو
 طبیعت کتنا چاہتی ہے۔

جادید کچھ نہ کچھ جواب دے کر اسے رجھا لیتا۔ لیکن شام کو گھر لوٹنے
 کی اسے توفیق ہی نہ ہوتی — حسب دستور بی پلا کو دس ساڑھے دس بجے
 تک گھر پہنچتا۔ اس کی آمد کا وقت قریب آتا تو ذکیہ ہر آہٹ پر کان لگا
 اس کی منظر دہنتی۔ وہ چاہتی کہ وقت بہت تیزی سے گزر کر دوڑ داندے پر
 ہونے والی کھٹ کھٹ کو جالے لیکن وقت جیسے اتنا داس، مضحکہ اور بھل
 ہو جاتا کہ اس کے قدم بڑی مشکل سے اٹھتے۔ اور ذکیہ اس طرح مرتے ہوئے
 وقت کے ہاتھوں میں محض ہو کر رہ جاتی۔

ابا اکثر شام کی دوپہالی چائے پی کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھا بھینگر دے

کی آواز میں کچھ گانے گھنٹا۔ کوئی ایسا مذہبی گیت جس کا آغاز موت کے خوف سے ہوتا ہے اور جو ختم ہونے تک زندگی ہی کا فوج بن جاتا ہے۔ وہ ایسا گیت اپنی طاقت کے تصور میں پناہ لینے کے لیے گاتا۔ لیکن جب اسے اس تصور سے وحشت ہونے لگتی تو وہ ایک دم اس طرح خاموش ہو جاتا جیسے بجتے ہوئے ریکارڈ کی آواز ریڈیو پر سوچ گھلا کر ایک سخت زدک دی گئی ہو اور پھر اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے پکارتا۔

ذکیہ — ذکی بیٹی — لیکن اس وقت ذکیہ تصورات کی وہ دنیا آباد کیے ہوئے ہوتی جہاں بڑھے ابا کے بیمار وجود کے لیے گنجائش نہ ہوتی۔ وہ ملازم سے کہتا دیتی کہ ”میں سو رہی ہوں۔ یا حمام کو رہی ہوں۔ یا مرغی ہوں۔“

اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کا پردہ سر کا کر وہ اکثر بہتی ہوئی سڑک کا نظارہ کرنے کے لیے اداس اداس سی کھڑی رہتی — لیکن اسی کھڑکی سے جاوید کی آمد کا نظارہ کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ جاوید اس سڑک سے آتا تھا جس سڑک پر بڑھے ابا کی کھڑکی کھلتی تھی۔ اگر اس کھڑکی تک ذکیہ پہنچ سکتی تو پھر اپنی آنکھوں کو بھی اسی کھڑکی کی طرح کھلی رکھ کر وہ جاوید کے آنے تک وہاں سے نہ ہٹتی۔ لیکن ابا کی موجودگی میں اس کھڑکی تک پہنچنا کن چھری سے اپنا گلا آپ کاٹ لینے کے برابر ہے۔

کالونی کے اکثر بوڑے باہوں میں باہیں ڈالے یاوک کی طرٹ جاتے ہوئے اُسے اپنی کھڑکی سے نظر آتے — وہ تصور ہی تصور میں جاوید کی باہوں

میں باہیں ڈالے خود کو پارک کی طرف جاتا ہوا دیکھتی۔ کھڑکی کے آگے سے گزرتے وقت کوئی ہسپلی نظر اٹھا کر اشارے سے اُس کو بلاتی تو اسے محسوس ہوتا جیسے اس کی ہسپلی اس کو بلا نہیں رہی ہے بلکہ طنز کے ذریعے نشتر لگا رہی ہے کہہ رہی ہے کہ جاوید کی مخالفت ساری کالونی نے کی تھی۔ لیکن تم تو اس کی ہر ادھر مرقی تھیں۔ اب زندگی بھر کھڑکی کھڑکی گھوم کر راہ نکستی رہو۔ ایک ایک درپچے میں اپنی ہی نظروں کی سوئیاں خپتی پھرو۔ اشارے سے بلانے والی ہسپلی کا منشا وہ نہ ہوتا جو ذکیہ سمجھ لیا کرتی۔ لیکن اس کو ذکیہ پر ترس ضرور آتا۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی، کیسی خوبصورت اور زندہ دل لڑکی ایک بے رحم شرابی کے پلے پڑ گئی ہے۔ لیکن اس کی ہسپلی جو کچھ اپنے شوہر سے کہتی وہ ذکیہ کے کانوں تک نہ پہنچ پاتا۔ اور یہ ذکیہ کے لیے ٹھیک ہی ہوتا۔

کوئی ہسپلی پھول والے سے پھول خریدتے خریدتے ہاتھ ملا کر ذکیہ کو بلاتی۔ کوئی زیادہ منجلی ہوتی تو یکاڑ یکاڑ کہتی۔ ذکیہ پیاری آج میرے ساتھ گھومنے چلونا۔ کبھی کوئی لڑکا کھس لڑکی کو شاہنگ کراتا پھرتا۔ ذکیہ جانتی تھی کہ یہ لڑکا اس لڑکی سے منسوب ہے۔ وہ قریب قریب ساری کالونی کو جانتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اُن محبت بھرے بیتے ہوئے دنوں کی سہانی یادیں جستم ہو کر رہ جاتیں جو جاوید سے انہی سڑکوں، شاہوں اور پارکوں میں چھپ چھپ کر ملنے میں گزرے تھے۔ لیکن یہ دن بہت کم تھے بہت مختصر۔ اس لیے کہ ذکیہ جاوید سے لڑی اور اس کی ہو گئی۔ جاوید ذکیہ سے ملا اور اس کا مورلہ پھر وہ بہت جلد وہ میاں بیوی بن گئے۔

جاوید نے فرقت کی آگ دیکھی اور نہ ذکیہ نے اس آگ کو اپنے دامن سے ہوا دی۔

جاوید نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ذکیہ کا دامن تھامنا ذکیہ نے جاوید کے آنسوؤں کی منی اپنے دامن پر محسوس کی۔
دو موجدیں بڑھیں، ملیں اور ایک ہو گئیں۔

اور ذکیہ کو اسی بات کا دکھ تھا کہ اس کے بیوی نہ بننے تک جاوید نے صرف ایک بار کہنے پر شراب پھوڑ دی تھی لیکن وہ اس کو حاصل ہو گئی تو سو سو طرح میتیں مرنے پر بھی وہ توجہ نہ دیتا اور بڑے ڈھنگ سے ذکیہ پر بوسوں کی بارش کر کے اس کا منہ بند کر دیتا۔

لیکن اب یہی محرومی ذکیہ کے سینے میں رہ بس کر ایک مستقل غم بن گئی تھی۔

ایک ایسا زخم جو محبتوں کی حفاظت کے لیے اپنی نرم نرم خالش کے ساتھ دل کے قریب ہی کہیں چپکے سے نمودار ہوتا ہے۔

جیسے کوئی بھولوی کو مسل رہا ہو۔

جیسے کوئی چکی کلیوں کو روند رہا ہو۔

جیسے کوئی گھنے سایوں کی ٹھنڈی فضا میں انگارے پھینک رہا ہو۔

جیسے کوئی اپنے بیٹے کی قبر پر سر جھکائے بیٹھا فاختہ کی آواز سن رہا ہو۔

لیکن جب جاوید رات کو دروازہ کھٹکھٹاتا تو ذکیہ کی ساری اداسیا

ساری محرومیاں، سارے غم، آہٹ پاتے ہی اس کو چھوڑ کر اس پاس ہی

کہیں بھاگ جاتے۔

ذکیہ ایک محبوبہ کی طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھتی۔

بالکونی سے اس طرح گزرتی جیسے اپنے ہی سائے سے بچ رہی ہو۔

اور پھر دو مضبوط باہیں اس کے پورے وجود کو جکڑ لیتیں۔ پھر اس کا جسم اپنی ساری حرارتیں اپنے سارے احساسات، اپنی ساری گنجائش کو ایک ہی مرکز پر سمیٹ کر اپنا سب کچھ ان دونوں کھلے ہونے بازوں کو دے دیتی جو بڑی محنت اور بڑے پیار سے اس کی طرف بڑھتے۔

لیکن صبح ہونے پر ذکیہ پر اس بات کا رد عمل بہت شدید ہوتا کہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے ہر رات جاوید کو اپنا سب کچھ دے کر جہاں اس کے اور خود اپنے جنسی جذبے کی تسکین کا باعث بنتی ہے وہیں اپنے پندار کو مجروح کر لینے کا سبب بھی۔ اور شاید یہ نزاکت بھی اس سے پوشیدہ نہ تھی کہ رات کو جاوید کے خلاف احتجاج نہ کر سکنے میں اس کی اپنی کبھی کوئی کمزوری مقصر ہے۔ جس کا محاسبہ کرنے کی اس نے تکلیف ہی گوارا نہ کی۔

لیکن ایک رات اس نے قطعی طور پر یہ طے کر لیا کہ وہ جاوید سے کھدیگی کہ وہ شراب یا ذکیہ دونوں میں سے کوئی ایک شے چن لے۔

اور رات کو جب جاوید لوٹا تو دروازے پر اس کو لینے کے لیے کوئی نہ تھا۔ دروازہ بھائی میں بھائی میں کوٹا کھلا پڑا تھا۔ جاوید نے دیوار کا سہارا لے کر سیڑھیاں طے کیں۔ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا، آبا کے کمرے کے آگے سے ہو کر گزرا۔ پھر ایک ایک کونے میں ذکیہ کو دیکھتا پھرا۔ ملازم کو بیدار

کیا۔ وہ سیدھے بابا کے پاس۔۔۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ سیدھے بابا کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی بابا کے کمرے میں داخل بھی نہ ہوا تھا کہ بابا نے بھینگر وں کی آواز میں کہا۔ ”میں جانتا تھا۔ تم یہاں آؤ گے۔“
 ”اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ذکیہ کہاں ہے۔“

”اور مجھے یہ بھی تم سے کہنا ہے کہ اس نے جو کچھ کیلئے درست کیا ہو۔“
 ”اور۔۔۔ اب تمہیں دونوں میں سے کوئی ایک چیز چن لینی ہوگی۔“
 ”شراب یا ذکیہ۔“

”اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ یہ ذکیہ کا قطعی فیصلہ ہے۔“
 ”ہاں۔ کیا تم اس بات سے واقف نہیں ہو کہ اسی شراب ہی نے میری صحت بھی تباہ کی۔۔۔ مجھے لوگوں کی نظروں سے گرایا۔ کیا میں تمہارے سامنے شراب کی بر بادوں کی زندہ مثال نہیں ہوں۔“

جاوید بوڑھے باپ کا مسخہ تکتا رہ گیا تھا۔ اس کو تعجب ہو رہا تھا کہ ابائیں آج برسوں پہلے کی رعونت کہاں سے عود کر آئی ہے۔ اس کے لہجے کی یہ خود اعتمادی اور رکھ رکھاؤ کس خفیب طاقت کا سبب ہے۔ وہ جو فیروز کی طرح گرہ گڑاتا تھا وہ شخص جس کو یہ راز معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی میں سوائے اس کی اپنی دلچسپی کے کسی اور کی دلچسپی شامل نہیں ہے۔ اور واقعی یہ زندگی کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ زندگی کے ہاتھوں زندگی کی یہ درگت بنے۔ اور یہی المیہ اس کا مقدّر بن گیا تھا۔ لیکن آج بابا کھوئی ہوئیں تو تین جمع کر کے زندگی کی راہ پر واپس چلا آیا تھا تو جاوید اس کا مسخہ تک رہا تھا۔ وہ

سمجھ رہا تھا کہ یہ نئی قوتیں اس کو ذکیہ نے عطا کی ہیں۔ ایسی قوتیں جو اس احساس کا عطیہ ہوتی ہیں کہ اپنی زندگی ابھی دوسروں کے لیے کچھ کر سکنے کی اہل ہے اور اب اس اہلیت اور اعتماد سے بات کر رہے تھے۔

جاوید نے لڑکھڑاتے ہوئے کو سی سنبھال لی۔
وہ بڑا بڑانے لگا۔ "لیکن اس کو گھر سے جانے کی کیا ضرورت تھی۔
وہ یہاں رہ کر کبھی تو مجھ سے سب کچھ کر داسکتی تھی۔"

ابا بھنے لگا۔ "اگر یہ ممکن ہوتا تو اب تک وہ تم سے کچھ نہ کر دیتی۔"
"تویوں کہو ابا۔ اس کے اس فیصلہ میں خود تمہارا بھی ہاتھ ہے۔"
"مجھے ہاتھ یا پاؤں اڑانے کی ضرورت نہیں ہے جاوید۔ میں نے
کب تم دونوں کی زندگی میں دخل دیا ہے۔"

"پھر بھی تحقیق علم تھا تو تم اسے روک سکتے تھے۔"
"چلتی ہوئی آندھیوں کو کون روک سکتا ہے جاوید۔ بڑھتے ہوئے
طوفانوں کو کون روک سکتا ہے۔ لو پڑھو اور بتاؤ کہ میں اسے روک
سکتا تھا؟"

جاوید نے ابا کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ لفافہ چاک کیا اور پڑھنے
لگا۔

"تو تم اس کے ان سارے ارادوں سے واقف تھے۔"
"واقف تھا نہیں ابھی ابھی کرایا گیا ہوں۔"
"میں شراب چھوڑ دوں گا ابا۔"

”شاباش، بھوڑو، بھوڑو، اسی وقت بھوڑو۔“

”لیکن کیا اب وہ نہیں آسکتی؟“

”تم نے خط پڑھ لیا نا۔ بھلا اب وہ کیسے آسکتی ہے۔“

”تو پھر تم میرا جواب کل اس تک پہنچا دینا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق ساری باتیں لکھ دوں گا۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن تم جا کہاں رہے ہو۔ بیٹھو، میں ابھی تم سے بہت ساری باتیں کروں گا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ مجھے اتنا س کے ٹن۔“

مجھے اس وقت معاف کر دیا۔ میں کل تم سے۔ میں اتنا س کا ٹن تمہیں کل لا دوں گا۔ اور جاوید نے ابا کا کمرہ بھوڑ دیا۔

وہ پھر نیچے گیا۔ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ خود ہی سمفل سمفل کر سیرھیاں طے کیں، بالکنی سے پاؤں دبا کر گزرا اور برے احمیان سے بیڈروم میں پہنچ کر اس نے مدھم مدھم ہری روشنی کا بلب بجلایا۔ کپڑے اتارے۔ اپنے ختم کا عکس آئینے میں دیکھا اور ذکیہ کے تکیوں میں صفحہ دے کر سسکیاں لینے لگا۔

صبح ہوئی تو وہ شراب بھوڑ چکا تھا۔

ذکیہ اب بڑھے ابا سے دن میں ایک آدھ بار ضرور مل سکتی۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتی۔ اس کو کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے دیتی۔ کبھی ابا

کو پکلیٹ کی پسالی جیسی نعمت مل جاتی تو وہ ذکیہ کی تعریفوں کے پل بانڈھ دیتے۔ "تم نے میرے بچے کو شیطان سے چھین لیاؤ کی۔ چڑیل سے نہایت دلائی تم نے میرے بچے کو۔"

اور وہ یہ کہتی ہوئی نکھل جاتی۔ "نہیں ابایہ سب تم نے ہی تو کیا ہے۔ تمہیں نے تو مجھے بڑھا دیا۔ میری مدد کی۔"

اور بڑھا بھینگروں کی آواز میں گانے لگتا۔ کوئی ایسا نہ ہی گیت جس کا آغاز موت کے خوف سے ہوتا ہے اور جو ختم ہوتے ہوتے زندگی ہی کا فوجہ بن جاتا ہے۔

وہ ایک دم چونک کر پھر بکا رہتا۔ "ذکیہ۔ ذکی بیٹی۔ لیکن ذکیہ اپنی خوبصورت سی دنیا میں مصروف ہو چکی ہوتی۔ شام کو آفس سے جاوید کی واپسی کے تصور ہی میں ذکیہ کا دن خوش خوش گزر جاتا۔ جاوید آفس سے گھر لوٹتا تو ذکیہ اس کے لیے بڑے اہتمام سے چائے تیار رکھتی۔ اسے اپنے ہاتھ سے صند کر کے کچھ نہ کچھ کھلاتی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر چائے پی چکتا تو اپنے ہاتھ سے اس کی ٹانگیں گدگداتی۔ یہ گرہ اتنی اچھی سی ہوتی کہ جاوید گرہ لگنے سے قبل ہی اس کے ہاتھ چوم لیتا۔ پھر یہ دونوں گھومنے کے لیے نکل جاتے۔

ابا بکا کر کچھ نہ کچھ فرمائش کر دیتا۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے میں چیری کھا سکتا ہوں۔"

اب ذکیہ کو وقت ہی نہ ملتا کہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر شام کے وقت

سڑکوں پر گھومنے والے جوڑوں کا تماشہ دیکھے اب تو وہ خود ہی سمجھیں،
گھومنے پھرنے والوں میں جاوید کے ہاتھ میں ہاتھ دے کہیں شامل ہوتی۔
دونوں گھوم پھر کر لوٹتے تو جاوید بڑا تھکا تھکا سا نظر آتا۔

رات کا کھانا اب وہ ساتھ ہی کھاتے لیکن جاوید کچھ اس طرح دوچار
لچھے نہ ہار کر تاجیسی سزا بھگت رہا ہو۔ عجیب بے دلی سی اس پر چھائی
رہتی۔ ذکیہ چھپر پھر کر باتیں کرتی۔ ادھر ادھر کے دلچسپ قصے نے بیٹھتی۔
وہ اس طرح ہاں میں ہاں ملاتا جیسے دل ہی دل میں ان باتوں سے چھکا رہا ہے
کے جتن کر رہا ہو۔ پھر ٹیل ہی پر جا ہماں لینے لگتا۔ پھر کچھ اس طرح منٹ منٹ
تک نہیں مذاق کی باتیں کرتا جیسے فرض پورا کر رہا ہو۔ کوئی شے اس کی ان مسکراہٹوں
کو جھلانی ہوئی معلوم ہوتی۔ وہ سگریٹ سلگا لیتا۔ پھر ادھر جلا سگریٹ پھینک
دیتا پھر ٹیلے لگتا۔ پھر چپکے سے بنزیر لیٹ جاتا کرد میں لیتا اور کرد میں لیتے
لیتے سو جاتا۔

ذکیہ دیر تک جاگتی رہتی۔ کبھی رنگ برنگے اون کے تانے بانے میں اپنی
پتلی لمبی لمبی سلامیاں اچھائے وہ اس پھرتی سے اپنی تحروطنی انگلیوں کو حرکت دیتی
جیسے اپنے ہی ذہن کی گتھیاں سلجھا رہی ہو۔ سلامیاں رنگا رنگ اون کا حسین
سامانا بانا بنی رہتیں اور اس کا ذہن احساسات اور تصورات کا ایک ہمیں سا
جال اس کے خوبصورت وجود کے اطراف بنتا رہتا۔ اس کے اندر چھپی ہوئی محبوبہ
بڑے سچ و ہج سے باہر نکل آتی اور اس کے سامنے ہی کھوئی ہوئی نکلا ہوں سے
کچھ اس طرح بیٹھی رہتی جیسے اپنے چاہنے والے کی آمد کا منتظر ہو۔ پھر دیکھتے

ہی دیکھتے جیسے کوڑ بجنے لگے۔

اور ذکیہ کے سامنے بیٹھی ہوئی محبوبہ ایک چھپا کے سے بالکن کی طرف
لپکی اور بالکن تک پہنچتے پہنچتے وہ پنچوں کے بل اس احتیاط سے چلتے لگتی جیسے
خود اپنے ہی پیروں کی آہٹ بھی اسے گوارا نہ ہو۔ پھر وہ مضبوط باہیں اسے تھام
لیتیں۔ پھر وہ کھلے ہوئے ترستے ہوئے ہونٹ اس محبوبہ کے پیاسے ہونٹوں
کی طرف بڑھتے اذن کی سلامتیوں اور ذکیہ کی محرومی انگلیوں کی خیمش رک جاتی۔
”یہ میں ہوں۔ یہ میں ہوں۔ جواب ابھی جاوید کا انتظار کر رہی ہوں۔

لیکن اب مجھے کیا چاہیے۔ جاوید اطمینان سے اپنے بستر پر سو رہا
ہے۔ پھر مجھے کس کا انتظار ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ کیسی کمی ہے
۔ یہ کیا درد ہے۔“

اور ذکیہ نے اذن کے رنگارنگ گولے صوفے پر پھینک دیے۔ پیردا کردہ
اسی طرح جاوید کے لیے کوڑ کھولنے جاتی تھی۔ وہ سو رہا تھا۔
لیکن ذکیہ کو ایسا لگا کہ جاوید کی نیند ایک ایسے مافر کی نیند ہے جو
سب کچھ لٹا کر رہزفوں سے بے خطر ہو گیا ہو۔

کیا جاوید اپنی خوشیاں لٹا کر سو رہا ہے؟
اور کیا سب کچھ پالینے ہی کی خوشی میں تم سے تمھاری نیند بھن گئی ہے؟
وہ ابھی جاوید کے چہرے سے نظریں بھی نہ ہٹا سکی تھی کہ اس کو محسوس ہوا
جیسے کوڑ بج رہے ہوں۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

اب اگر کبھی جاوید، ذکیہ کی طرف التفات کرتا بھی تو اس التفات میں نہ تو جذبات کی وہ شدت اور فراوانی ہوتی جو اڈاڈ کر بھوم بھوم کر کھپانے والے بادلوں کی کیفیت کے مترادف ہو۔ نہ ذکیہ کے جسم سے وہ شرارے ہی پھوٹتے جنہیں مسرت کے پھول کہا جاسکتا اور نہ ہی اس کو اپنے جسم کے ہر حصے پر پھول کھلتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اب خود اس کی اپنی آنکھیں بھی اپنے ہی بدن کی اُس رعنائی سے محروم ہو گئی تھیں جس کو کبھی جاوید سانس لیتی ہوئی چاندنی کا نام دیتا تھا۔

”تھار ابدن ایک سانس لیتی ہوئی چاندنی ہے ذکی جس میں میرا وجود ڈوب ڈوب کر ابھر رہا ہے۔“
اور اس سانس لیتی ہوئی چاندنی پر وہ اڑتے اور بھومتے بھامتے بادل کی طرح چھا جاتا۔

ایک رات اس نے شبِ خوابی کا لباس پہنتے پہنتے خود کو سر سے پیر تک آئینے میں دیکھا۔ پھر اس نے اپنا لباس دور پھینک دیا اور ہر زاویے سے اپنے بدن کو دیکھتی رہی۔ پھر تصور ہی تصور میں اس کو جادو نے چوما بال پشانی، آنکھوں، ہونٹوں اور پیر کی انگلیوں تک اس کے بدن پر شگوفے کھلنے لگے۔ پھر کسی نے محسوس کیا جیسے میں جکڑ لیا۔ پھر اس نے محسوس کیا جیسے وہ کیف و سرور کے دریا میں ہی جا رہی ہے۔

اس نے اپنی محزوظی انگلیوں سے سوئے ہوئے جاوید کے گھنے بالوں میں ٹنگھ کی۔ پھر اپنی سانس کا عطر اس نے جھک کر جاوید کے چہرے پر چھڑک دیا۔

جاوید نے بے نیازی سے کروٹ لی اور وہ اس کے سر پرانے پلنگ کے پیچھے اس طرح چھپ گئی جیسے خود نہیں چھپ رہی ہو بلکہ اپنے سینے کے اندر محبوس ہوئی ایک دنیا کو چھپا رہی ہو۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

اس کے اندر کی دنیا باہر کی حقیقتوں سے ٹکرا اٹھی اور اس کی ساری ہستی جیسے

لمحے بھر کے لیے ڈول گئی۔

اس نے محسوس کیا جیسے جاوید سو نہیں رہا ہے، وہ تو دروازے پر کھڑا اس

کی اپنی ذکی کا منتظر ہے۔

اس نے پھر جاوید کو دیکھا۔ وہ بستر پر بے خبر سو رہا تھا۔ بیدار نہیں تھی

روشنی اس کے چہرے کو اس وقت بھی نکھار رہی تھی جبکہ اس نے روز کی طرح آج

شیو بھی نہیں کیا تھا۔

اس نے اپنی مخروٹ انگلیاں پھر جاوید کے گھنے بالوں میں پیوست کر دیں۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ

کوئی پھر دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا

اس نے چونک کر اپنے ہاتھ جاوید کے گھنے بالوں سے اس طرح ہٹا لیے جیسے

چوہی کوئی ہوتی بچڑھی گئی ہو۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ

کسی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔

وہ اپنے تصورات کی دنیا سے ایک ہی جست میں حقائق کی اس دنیا میں
لوٹ آئی۔ اس کو سب کچھ یاد آگیا۔ یہ سعید ہوگا۔ اس کے اپنے جاوید کا چہرہ
بھائی۔ اس کا اپنا کھلنڈرا اور شریہ دیور۔ جو کالج سے پھٹیوں میں آیا ہوا
تھا۔ جو اس سے کہہ گیا تھا کہ سکند شہو دیکھ کر وہ آج رات گئے واپس لوٹے گا۔
اس نے ملازم سے کہہ دیا تھا کہ وہ بڑھے بابا کے کمرے کے سامنے سو رہے تاکہ سعید
میاں آئیں تو دروازہ کھول سکے۔

اس نے تھکی ہوئی بو جھل آنکھوں سے کمرے کے باہر دیکھا۔
کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

اس نے اپنے بدن کی چٹکی ہوئی چاندنی کو شب خوانی کے لباس میں جلدی
سے پھپھایا اور اس کے قدم بالکھنی کی طرف اٹھ گئے تاکہ ملازم کو جگا سکے۔
بالکھنی سے گھر کو وہ اس طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھی جیسے اپنے ہی سائے
سے بچ رہی ہو اور سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے اس کا سایہ بھی چلنے سے اس کو چھوڑ
کر دیوار کی اوٹ میں اس طرح جا پھیا جیسے اس کی واپسی پر اس کی ساری ڈھکی بھی
تناؤں، دبے دبے جذبوں اور سہمی سہمی خوشیوں سمیت اس کو دبوچ لے گا۔
ملازم اپنی دن بھر کی محنتوں کا پھل نیند کی صورت میں وصول کر رہا تھا۔
اس نے ملازم کو جگا یا نہیں۔

اس نے خود بڑھو کر دروازہ کھولا اور لمھے پھر کے لیے سڑک کی آوارہ روشنی
کرن کرن بن کر اس طرح اس کے دروازے میں در آئی جیسے سینے میں راز ہائے پرتہ۔
اور پھر وہ مضبوط باہیں اس کے سارے وجود کو جکڑ لینے کے لیے آگے بڑھیں۔

”ذکی مجھے اپنا لو۔“ اس کی زبان میں جیسے لکنت تھی لیکن اس کی لغزش پانے خود اس کو سہارا دیا۔

”تم — میں تمھاری ذکی نہیں ہوں“ ذکیہ دیوانوں کی طرح اس کی کھلتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتی رہی۔

”میں تو تمھارے — میں تو تمھارے —“ پھوڑ دو مجھے — تجھے چھوڑ۔“ لیکن دو کھلے ہوئے بازوؤں نے اس کو جکڑ لیا۔

اس نے اپنی ساری حرارتیں۔ اپنی ساری قوت، اپنے سارے ارادوں کو ایک ہی مرکز پر سیٹ کر ایک ہی تڑپ میں اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا۔ لیکن ان مضبوط باہوں نے اسے پھر سہارا دیا۔

”ذکی ضد نہ کرو۔“ میں تمھاری پیاسی آنکھوں کے پیام پڑھ چکا ہوں کی۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ پھر شرارے پھول بننے لگے۔

لیکن بالکنی نے اس بار اس کے سائے کو کسی مضبوط و توانا سائے کے ہاتھوں مجبور محض بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھتا ہوا نہیں دیکھا۔

بالکنی کی مدہم روشنیوں نے اس کے سائے کو پھر کبھی دیکھا ہی نہیں۔ صبح ہوئی تو سیڑھیوں کے نیچے کا دروازہ بڑھے ابا کے کمرے کے دروازے کی طرح بھائیں بھائیں کرتا کھلا پڑا تھا۔

دوسرے دن رات گئے جاوید واپس آیا تو دروازے کی کھٹ کھٹ

سُن کر بڑھے ابّا نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔
 سڑک کی آوارہ روشنی کون کون بن کر اس طرح دروازے میں درآئی
 جیسے کسی بیسوا کے محرم کے بند کھل گئے ہوں۔
 رات کے اٹوٹ سٹاٹے میں جادو کی آواز فضاؤں میں تیرنے لگی۔
 ”کون ہو تم — جاؤ خود کو اپنے کمرے میں بند کر لو۔“
 اور جادو کی آواز کے نیچے بڑھے ابّا کی نسکیاں دب دب گئیں۔
 کوئی دیوانہ رات بھر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔
 کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ۔
 لیکن کوئی ذکی اپنے کسی جادو کو لینے کے لیے نہیں آئی۔

مسدود راستے

اس سڑک کے چوڑے چکے سینے سے میرے قدموں کی چاپ کا وہی
 تعلق ہے جو میرے اپنے سینے سے میرے دل کی دھڑکن کا۔ فرق ہے تو بس
 یہی کہ میرے سینے میں صرف ایک دل ہے اور اس سڑک کے چوڑے چکے سینے
 میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دل قدموں کی چاپ کے سہارے اس کے
 اپنے دل بن گئے ہیں۔

اس سڑک کا کشادہ سینہ کچھ ہی دنوں پہلے تک ایک اور چاپ کا
 راز داں تھا۔ لیکن اب وہ چاپ کہیں کھو گئی ہے۔ یہ ایک بارہ سالہ لڑکے کے
 قدموں کی چاپ تھی جو اس سڑک کے بے شمار دلوں میں سے ایک ننھا سا دل
 تھا، جو تین دن کی بھٹیوں کا تصور ذہن میں لیے اپنے اسکول سے خوش خوش

گھر لوٹا لیکن یکا یک اس کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا اور سڑک نے اس کے قدموں کی چاپ پھر نہیں سنی۔

میں کینڈل کا لونی سے نکل کر نسبتاً لمبا چکر کاٹتا ہوا اسٹینلی گریز اسکول سے اسٹیٹ بینک کی عظیم عمارت کے پہلو میں پہنچتا ہوں اور اس عمارت کے سامنے میں پہنچ کر اپنی تہی دستی کے باوجود جب اس عمارت سے زیادہ خود اپنے عظیم ہونے کا احساس ذہن میں سر اٹھاتا ہے تو خالی جیبوں کو بھول کر سر اُڑا کر گور جاتا ہوں۔

ایک اور سیدھا سا دارا راستہ بھی ہے جو ٹیبل فلڈ اور ہائی اسکول اور معین گراؤ اسٹورس سے ہو کر جان کپینی کے بالکل مقابل میں اسٹیٹ بینک کی طرف مڑ جاتا ہے جو ہیس بائیل کی اس دوکان سے ہو کر لے جاتا ہے جیسے کہ کوئی روشن ریشمانی چلتا ہے جو یہاں مقامی شاعر (LOCAL POET) کے خطاب سے پکارا جانے پر فخر محسوس کرتا ہے لیکن میں نے یہ راستہ اپنے پرہیزگار دیکھا ہے۔ میری بیوی کی دعاؤں کے لیے جب تک رتب کویم کا باب اجابت داند ہوگا یہ راہ بھی میرے لیے مسدود رہے گی۔

انسانی زندگی کا تعلق اسٹیٹ بینک، اسکول اور بائیل کی دوکان سے پہلے گراؤ اسٹورس سے ہے اور اسی لیے نہ میں اسٹیٹ بینک کا مقروض ہوں، نہ بائیل کی دوکان کا۔ اپنے بچے کی خفیس، اسکول میں کبھی کبھی قرض ہو جاتی ہے تو کسی نہ کسی طرح ادا بھی کر دیتا ہوں۔ اس قرض کی میعاد ظلم کی میعاد کی طرح طویل نہیں ہوتی، لیکن معین گراؤ اسٹورس کی قرض کی میعاد طویل ہے۔

کوئی سال بھر سے میں نے یہ راستہ اپنے پر بند کر رکھا ہے۔ مظلوم میں ہوں یا کرانہ اسٹورس کا مالک جس کا غلہ میں اور میرے افرادِ خاندان نے زندگی کی ضرورت، جان کو استعمال کر لیا ہے، فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ معاملہ صرف سو روپے کا ہے۔ ان سو روپیوں کی ادائیگی میرے لیے اتنی کھٹن ہو گئی کہ میں نے خود پر کتنے ہی راستے کھول لیے اور کتنی ہی راہیں بند کر لیں، اور یہ راستے کھول لینے سے راستے بند کر لینے تک کا جو جذباتی وادِ عمل ہے اس سے میرے ملک کے نیا قلعی واقف نہیں ہیں۔

یہ لوگ اس سے نابلدھ بھی نہیں ہیں کہ وہ ضرورت میں جو پوری ہی نہیں ہو سکتی ان کے گھٹنے اور بڑھنے کا کیا سوال، لیکن وہ یہ نعرہ دانت لگاتے ہیں۔ کسی فرد کی زندگی کی ضرورت کسی راج بھون کے ڈنر کا مینو تو نہیں ہے کہ وہ لوازمے گھٹا کر کاغذ پر گورنر کے جذبہ حب الوطنی کو مطمئن کر دیا جائے۔ لیکن ہٹائیے بھی یہ باتیں میری زندگی کے نئے نئے راستوں میں میرا زور سفر لائیں۔ لیکن غضب و وجہ ہو جب میں نے دوسرا راستہ بھی اپنے پر بند کر لیا اور یہ راستہ تو صرف تیس روپیوں کے لیے میرے قدموں کے نیچے سے کھسک گیا۔

شیوپال سلمان آدمی ہے، میسٹر راستوں کے مسدود ہونے میں کسی سلمان آدمی اور کسی ہندو آدمی کی کوئی تخصیص نہیں ہے، مجھے صرف آدمی سے غرض ہے جو میری راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔

شیوپال کی سلامتی کا تذکرہ مجھے یوں کر نا پڑا کہ اس کا نام سنن اور اس

کی بیوی کا نام آمنہ ہے۔ شیو پال تو کوئی اور ہی شخص تھا جو کبھی اس چھوٹی ٹہسی
دکان کا مالک تھا اور جس کا کاروبار اتنا چمکا تھا کہ اس نے قلب شہر میں کہیں
بڑی سی دوکان کر لی تھی اور اپنے نام کی راکٹسی رحمن سے وصول کی تھی جو رقم
ادا کرنے کے بعد خود شیو پال بن بیٹھا تھا۔

اس شیو پال نما رحمن کا کاروبار بھی اتنا چمکا کہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی
سبحان کو ایک اور دوکان کھول دی جو میرے راستے میں نہیں پڑتی تھی۔

شیو پال کالونی کے شریفوں کو ضرورت کی ہر چھوٹی بڑی شے یا تو جرٹر
میں کھیتا دینی کر کے دے دیتا یا ان کی تحریر لے کر۔ کینڈل کالونی کے شریفوں
میں اس نے میرا نام سرفہرست اس لیے رکھا تھا کہ میں نہ بڑے آدمیوں کی طرح
اکڑھتا تھا نہ چھوٹے آدمیوں کی طرح گھگھکیاتا۔ گھڑی دو گھڑی دوکان پر رک کر
چلتا چلتا آخریت پوچھ لیتا۔ آمنہ چائے کی پیش کش کرتی تو دوکان پر کھڑا کھڑا
شکریہ ادا کر کے مزے لے لے کر چائے پی لیتا۔ دارجلنگ سے راست منگوالی
گئی چائے کی پی کی تعریفیں کرتا تو شیو پال اور مسز شیو پال بھولے نہ سماتے تھے۔
میرا سماجی موقف گویا اتنا مستحکم تھا کہ مسز شیو پال کی یہ پیش کش قبول کر کے
میں اس کی اپنی نظروں میں اور دوسرے تمام گاہکوں کی نظروں میں جیسے شیو پال
کے خاندان بھر پر احسان کرتا اور انہی میرے احسانات نے جب مجھے شیو پال
کا تیس روپے کا مقدوض کو دیا، تو میں نے مارے شرم کے رقم کی ادائیگی تک کے
لیے یہ راستہ بھی اپنے پر بند کر لیا تھا۔

اب میرے لیے بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ گھر سے دفتر تک پہنچنے کے لیے

میں زندگی کے بڑے لمبے فاصلے طے کرتا۔ سینٹ روڈ پر اس طرح قدم رکھتا جیسے
 ذکیلے پتھروں پر چل رہا ہوں۔ میرے پیر زخمی ہو جاتے۔ میرے احساسات بھی
 مجروح، آپ نے احساسات کی یہ جو احتیاج کا ہے کو محسوس کی ہوں گی جو راہ میں
 مسدود ہونے اور سینٹ روڈ کے پتھر ملی نا ہوا مسٹرک بن جانے کا باعث
 ہوتی ہیں اور جن پر آدمی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چلتا ہے جیسے اس کو صرف وہی
 راستہ دکھائی دے رہا ہو جس سے وہ بھاگتا پھر رہا ہے۔

مشہور پال، معین الدین، موہن سنہا، قلندر خاں اور نیا ملبیسی
 کیفے کا حسین سینڈھ۔ کیسے کیسے مرحلوں سے گزرنا ہوتا۔ موہن سنہا تعلیم یافتہ
 آدمی ہے۔ گریجویٹ ہے۔ میں اس کا جہم جہم کا مقروض ہوں، اس کے دادا
 نے میرے دادا کو حویلی میں پہنچ کر نرم گرم ایرانی قالینوں پر قرض دیا۔ اس
 کے باپ سے میرے ابا نے اپنا موٹر روک کر قرض لیا۔ میں نے بھی چلتے چلتے
 سائیکل موہن سنہا کی دوکان کے پیٹ سے لگا کر کھڑی کر دی۔ کیونکہ اس میں
 اسٹینڈ نہیں تھا اور موہن سنہا سے گرم تیلون کے لیے وہ لٹن سٹنڈ قرض لے لیا۔
 کپڑوں سے بھری ہوئی اس کی دوکان سے جب صرف ڈیڑھ گز بڑا کم ہو
 گیا تو بڑے ٹھٹھے اور گنت سے میری ستر پوشی ہوئی۔ وسٹنڈ قرض کی ہو کہ
 مانگے کی، وسٹنڈ ہوتی ہے۔ خریدی ہوئی معمولی چمک کی تیلون آپ کی
 راہ میں کانٹے تو نہیں بچھاتی لیکن دیکھنے والے راہ گیروں کی آنکھوں میں
 کھٹکتی ضرور ہے۔

وسٹنڈ کی بات بالکل مختلف ہے۔ وسٹنڈ کی تیلون میں چھپی ہوئی

ٹانگیں اگر سوکھ کر ٹھنڈ ہو گئی ہیں تو بھی مضائقہ نہیں چاہے ان ٹانگوں کا سارا گودا
 پھل کر کبھی کا بہرہ چکا ہو، لیکن آپ نے دسڈ کا غلاف چڑھا دیا ہے تو پھر راہ
 چلتے لوگ نظروں ہی نظروں میں پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ اور میں نے جب
 یہ غلاف چڑھایا تو وہ راستہ اپنے پر بند کر لیا جو مجھ جیسے ہر راہ گیر کو طوعاً و کرہاً
 موہن سہا کی دوکان تک لے جاتا تھا۔ یہ راستہ تمیر اور اسٹریٹس کے درمیان سے خود
 پر بند کر لیا تھا۔ اور اس طرح میرے اپنے گھر سے میرے دفتر تک تین راہیں میرے
 لیے سدود ہو گئی تھیں۔

قلندر خاں اور نیو امپسی کا حسین سیٹھ تو ایسے دربان تھے جو شہر کی تفصیل
 کے صدور و داندے پر کھڑے راستہ روک لیتے تھے۔ میرا ان دربانوں سے بچ کر
 اپنے دفتر کے حدود میں داخل ہونا بہت کڑا مرحلہ تھا۔ اسی لیے میں نے ان سے
 اقطاع پر تصفیہ کر لیا تھا، بلکہ یوں سمجھیے کہ خود ان لوگوں ہی نے مجھ سے اقطاع پر
 تصفیہ کرنے کے لیے اپنی عاقبت جانی لیکن تفصیل کے ان دربانوں تک پہنچنے
 کے لیے اب صرف ایک ہی راستہ میرے لیے رہ گیا تھا۔

یہ راستہ میرے لیے سب سے زیادہ گھٹن تھا۔ اس راستے سے ہو کر گونا گویا
 طرح بھی میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس راستے پر کوئی میرا بہت دور تک پہنچا
 کرتا تھا۔ وہ میرے انتظام میں جیسے وہاں نہ کھڑے ہو کر کھڑا رہتا اور اگوں اسے مل
 جاتا تو دوڑ کر میرے سینے سے چمٹ جاتا۔ وہ مجھے میرے لیے قیامت سے کم نہ
 ہوتے۔ جب میرا تقاب کرنے والا یہ بارہ سالہ لڑکا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک
 لیتا۔ میں اس کا چہرہ تکتا رہ جاتا۔ میں سو بار مر مر کر جی اٹھوں، تب بھی تمھارا

قرض کیسے ادا ہو سکتا ہوں، تم تو جہاں بھی ہو میرا راستہ روک سکتے ہو۔ میں بکھر
 سکر اس کا نسخہ لگتا رہتا اور وہ آہستہ آہستہ میری خشک آنکھوں میں نہی بن کر گھلنے
 لگتا، پھر خون کی بوند بوند بن کر میرے دل میں اتارتا۔ پھر نشتر بن کر نس نس میں
 ٹوٹنے لگتا۔ اس لڑکے کا قرض مجھ پر میرے اپنے دج و کا قرض ہے۔

آپ نے پہچان لیا ہو گا، یہ وہی بارہ سالہ لڑکا ہے جس کے متعلق میں
 نے پہلے بتایا ہے کہ وہ تین دن کی چھٹیوں کا تصور ذہن میں لیے اپنے اسکول
 سے خوش خوش گھر لوٹا لیکن یکایک اس کے دل نے دھڑکننا پھوڑ دیا اور بڑھک
 نے اس کے قدموں کی چاب پھر نہیں سنی۔ اور یہ راستہ میرے اسی نسخے قرض
 خواہ کے اسکول کی وسیع عمارت کے سامنے سے ہو کر میرے اپنے دفتر کو جاتا ہے۔
 اس لڑکے نے میرے اپنے کندھوں پر میری اپنی ہستی کا بوجھ رکھ دیا ہے۔

میں تو یہ سوچا کرتا کہ جب وہ میرے برابر کا ہو کر میرے ساتھ ساتھ
 چلے گا تو زندگی کے تکتے ہی کٹھن راستے ہمارے لیے سہل ہو جائیں گے،
 میں نے اس لڑکے کو ٹوٹ کر چاہا ہے، میں نے اپنے ذہن پر اپنے دل پر
 یہاں تک کہ اپنے مزاج پر اس لڑکے کی گرفت محسوس کی ہے لیکن اس کے
 باوجود، میں نے اس کو کچھ نہیں دیا۔

اس نے کتنی منتوں سے امتحان میں پاس ہو کر مجھ سے گھڑی سہل
 کی، جو کچھ ہی دنوں بعد بقول اس کے "اٹار اینڈ کو" میں محفوظ ہو گئی یعنی
 سیٹھ تارا چند کے پاس رہن ہو گئی۔ پھر اس نے مجھ سے ایرگن کا وعدہ لیا اور
 دوسرے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اپنی بے

بضاعتی اور تہی داسنی پر میں شرم محسوس کرتا، اس نے مجھے اس آزمائش میں مبتلا ہی نہیں کیا اور نہ مٹنا کھیلتا کہیں جا چھپا۔

مجھے کیا خبر تھی کہ اس کے پاس وقت اس قدر کم ہے، لیکن کوئی خوف میرے دل کے گوشوں میں سہا سہا ضرور تھا۔ ایک جنگ سی میرے ايقان اور دلہمے کے درمیان جاری تھی۔ جانِ پورِ اتم راستہ چلتے چلتے میرا ساتھ چھوڑ دو گے۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں کسی دہم کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتا۔ واہمہ بصیرت کی موت ہے۔ اور میں نے خیال ہی خیالوں میں اس کو تنویر نو جوان کا روپ دے دیا۔ میں نے تصور ہی تصور میں اس کو کتنی ہی بار سہرا بانوہا۔ دو لہا بنا کر سینے سے لگا لیا، لیکن جانے کیوں یہ خیالی پیکر ہمیشہ دھندلا دھندلا ہی رہا۔ میں نے اس دھند پر کتنی ہی بار وہ جھنجھلاہٹ محسوس کی۔ تصور اتنا دھندلا کبھی تو نہیں ہوتا۔ خیالی پیکر اس طرح مٹے مٹے بھی تو نہیں ہوتے۔ پھر یہ سب کیا ہے۔ وہی خوف نہاں خانہ دل سے پھر سر اٹھانے لگتا۔ جانِ پورِ اتم راستہ چلتے چلتے میرا ساتھ نہیں۔ بالکل نہیں۔ یہ واہمہ ہے، اور واہمہ بصیرت کی موت ہے لیکن جب کھیلے کھیلے اس کے دل کی دھڑکن بن ہو گئی تو دو چار دن بعد میں اس کے ساتھی کو وہ نوٹ بک لوٹانے کے لیے اس کے اسکول کے احاطے میں داخل ہوا جو اس نے امتحان کی تیاری کے لیے نوٹس لینے کی خاطر اپنے ہم جماعت سے حاصل کی تھی۔ تو میں نے محسوس کیا کہ بصیرت آپ اپنی موت مر گئی ہے اور واہمہ مسکراتا کھڑا ہے، کہہ رہا ہے، تم نے پہچانا نہیں، میں ہی

تو بصیرت تھا۔

صبح بھکی تو میں شام کے تصور میں سرگرداں رہا۔ مشام آئی، جھک کر اپنی چادر میں دنیا بھر کے سمیٹ لیا تو میں بھی اپنی تنہائیوں کو گوشہ دل سے نکال کر سینے سے لگاتا رہا۔ اس درد کی کھک کم کھکی رہی، فزوں تر بھی۔ جو بیتنا تھی مجھ پر بہتی — نہ میں ٹھہرانہ وقت رکا۔

لیکن یہ راستہ میں اپنے لیے کھلا نہ رکھ سکا۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ میں مدرسہ عالیہ کے اس احاطے میں داخل ہوا ہوں۔ دنیا کی نظر بچا کر چور کی طرح اس بارہ سالہ لڑکے کے ساتھ احاطے بھر میں گھومتا پھرا ہوں۔ دیوار پر اس کا نام لکھا ہے، درختوں پر اس کا نام کھودا ہے، یہاں اس سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یہاں وہ انٹروں میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ یادوں کی انجن سجا کر میں نے زمین پر رکھی ہے، دیپ بلائے ہیں، چراغاں کیا ہے، پھر اس انجن کو چیکے سے اٹھا کر میں نے دل میں چھپا لیا ہے اور اسکول کے احاطے سے مکمل کر ایک ایسی دنیا میں آگیا ہوں جہاں شیو پال، معین الدین موہن سنہا، قلندر خاں اور نیو امیس کا سینٹ سیڈ میرے منتظر ہیں۔

مجھے بہر حال اسی دنیا میں سانس لینا ہے جس دنیا میں اوپر بتائے ہوئے میرے سارے ساتھی دنیا کا دوبارہ جلاتے ہیں۔ میں صرف اسی حد تک کبھی اپنے پر قادر نہیں ہوں کہ ان رستوں سے نہ گجروں جن راستوں پر مجھے ان کی مزاحمت کا خدشہ ہو۔ مجھے بہر حال انہی راستوں سے گزرنا ہے، کبھی نظر پر، کبھی دامن بچا کر، کبھی سائیکل دوڑاتا ہوا، ہواؤں کے دوش

پر سوار ہو کر کہ کوئی دیکھ بھی لے تو روک نہ سکے۔ کبھی پو پھٹتے سنے، کبھی رات
 ڈھلے۔ کبھی دکانیں کھلنے سے کچھ ہی قبل، کبھی کار و بار بند ہونے کے کچھ ہی بعد
 کبھی میں زندگی کے پیچھے چلا ہوں، کبھی زندگی میرے پیچھے۔ کبھی زندگی نے
 پیٹڈ چھڑا کر فراہم ہونا چاہا ہے تو انھیں راستوں پر میں نے اس کا تعاقب بھی
 کیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے پاس سے کبھی کبھی اس طرح بھی گزر گئے ہیں،
 جیسے اجنبی ہوں، یا پھر میں نے زندگی کو پہچاننے کی کوشش کی بھی تو اس نے
 ہنہ پھیر لیا۔

سب کچھ ہوا ہے، ہوتا رہتا ہے، جانے کب تک ہوتا رہے گا۔
 لیکن اسکول کے اس راستے پر میرے قدم اٹھ ہی نہیں سکتے۔ اس راستے سے
 گوریا نائیرے بس میں نہیں ہے۔ میں نے زندگی کے دوسرے راستوں کو اس
 راستے سے ملنے ہی نہیں دیا ہے۔ میں نے آپ سے کہا ہے ناکہ اس لڑکے کا قرض
 بھہ پر میرے اپنے دجو و کا قرض ہے۔ سو میں نے یہ راستہ اپنے پر خود ہی بند
 کر رکھا ہے۔

ایک دن مگر ایک بات ہوئی۔ میں آنے والے خطرے کی آہٹ پا چکا تھا۔
 حسین سیٹھ کو بہت سمجھایا، منایا، لیکن وہ نہ مانا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا
 ”تم قسط بھی پابندی سے نہیں دیتے ہو، آج پہلی تاریخ ہے، سارا قرض یکمشت
 چکا دینا ہوگا، ورنہ تم اپنے دفتر سے باہر نہیں جاسکو گے۔ مجھے اپنی عزت کا پاس
 تھا۔ یہی ایک چیز جسے آج تک زمانے کے دست برد سے بچا سکا تھا حسین
 سیٹھ آج اسی کا دریے تھا۔ زندگی کی گاڑی قرض کے پہیوں پر چل تو سکتی ہو“

لیکن عزت کی عمارت قرص کی اینٹوں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ میں نے گردن جھکا لی، اثبات میں سر ہلایا، شام ہونے تک میں نے تنخواہ حاصل بھی کر لی اور میرا ان قرص خواہوں کے حوالے سب کچھ کر دیا جو ہمیشہ بھر زندگی کی نگاری ڈھیلے والے تھے۔ میں ٹٹ چکا تھا، میری جیب میں صرف تین روپے اکیتس پیسے رہ گئے تھے۔ لیکن حسین سیٹھ۔۔۔ وہ میرے دفتر کی عمارت کے بالکل مقابل اپنے ہوٹل میں بیٹھا مجھے تاک رہا تھا لیکن میں نے طبی خود کو دفتر ہی میں چھپائے رکھا، سب ساتھی چلے گئے، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ سدرج کی کوئس بھی جانے لگیں، اندھیرے میرے رفیق ہیں۔ سچ پوچھیے تو اندھیرے برغم کے رفیق ہوتے ہیں، ہر دکھ کے، ہر درد کے، اندھیروں میں زندگی دھندلانے لگتی ہے تو درد چمک اٹھتا ہے۔

میں اپنے جسم کو پوروں کی طرح چھپا کر دفتر کے گیٹ تک لے آیا لیکن سڑک پر پھیلی ہوئی روشنی میں مجھے حسین سیٹھ نے دیکھ لیا۔ اس نے مجھے پکارا۔ میری روح کی پہنائیوں نے اس کی آواز سنی لیکن میں نے اپنے جسم کو اچھالی کر پاس سے گزرتے ہوئے رکشا میں پھینک دیا۔

حسین سیٹھ سائیکل پر سوار ہو کر میرے تعاقب میں روانہ ہو چکا تھا۔ اس کی نظر میں چاروں طرف مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ مجھے رکشا میں سوار ہوا ہوا اس نے دیکھا نہیں۔ پھر ایک عمارت کی اوٹ میں میں نے اپنا رکشا کوایا اور کو دھڑا۔ پھر فٹ میدان اسٹیڈیم کی زیر تعمیر عمارت کے مختلف حصوں کے پیچھے خود کو چھپاتا ہوا میں ایک سڑک پر آگیا۔ میں نے نہیں صرف میری آنکھوں

نے پیچھے پلٹ کر دیکھا، حسین سیٹھ آ تو نہیں رہا ہے۔ اور جلدی جلدی میں نے نہیں، میرے قدموں نے سڑک ناپ دی اور جب ایک موٹر پر میں نے رکنے دم لیا تو میں نے دیکھا کہ کوئی بارہ سالہ لڑکا اس سڑک کے نیچوں بیچ کھڑا مجھے تک رہا ہے جس سڑک پر سے گزرا کہ میں زندگی کے اس موٹر تک آ پہنچا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، شاید یہ وہی سڑک ہے جو عالیہ اسکول کے سامنے سے گزرتی ہے۔ شاید یہ وہی لڑکا ہے جو میری تنہائیوں کا ساتھی ہے اور جس کا قرض میرے وجود پر ہے۔ شاید آج بھی اس نے میرا دستہ روکنا چاہا تھا لیکن میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے پلکیں بھپکائیں حسین سیٹھ مجھے نظر نہ آیا، لیکن یہ لڑکا برابر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بڑا دلگیر تھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ شاید یہ وہی بارہ سالہ لڑکا تھا جو کھیلے کھیلے مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ میرا سب سے بڑا بیٹا، میرا سخت جگر۔ وہ مجھے اس طرح حیران کھڑا ہوا دیکھ کر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا، جب پاس آ گیا تو میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، ہم ایک دوسرے کو پس دیکھتے رہے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن جانے کیوں میری پلکیں بھی نم ہو گئیں اور اس کا چہرہ اور بھی دھندلا گیا۔ پھر میں نے ندامت سے گودن جھکالی۔ اُن میں کس رہ گزرا کو پیچھے پھوٹ چکا تھا۔

سہمان

سو فی نگری گونج اٹھی تھی اور اس نے لاکھ ختن کیے کہ اس گونج کو صرف اپنے ہی من میں اس طرح بھپائے رکھے کہ کوئی بھی کچھ نہ سن پائے۔ لیکن یہ گونج تو بھپائے نہ بھپتی تھی۔ خود اس کے اپنے چہرے پر چاندنی بن کر پھیل گئی تھی، یہ کیسی آواز تھی۔ یہ آواز کا کیسا جادو تھا، یہ کیسی ٹھنڈی چاندنی تھی۔ یہ کیسی صبح کی نرم گوم دھوپ تھی جو اس میں سما گئی تھی اور اس کا سارا وجود میں تاپ چ رہا تھا۔

کوئی آ رہا ہے۔ کوئی آ رہا ہے۔ جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔ جس نے اس کا سب کچھ اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ کیسی دھاندلی چال تھی اس نے کہ وہ نہ آیا، تو ایسی محبتیں جو اسے حاصل تھیں وہ بھی آہستہ آہستہ

اسے چھوڑنے لگیں۔

شفی کی ماں بھی تو اس کی اپنی ماں کے برابر تھیں، لیکن کس شفا کی سے کہہ دیا تھا انھوں نے۔۔۔ بیاہ لانے دیکھی اور کو آخر اس کا بھی تو ارمان نکلتے اور وہ سوچنے لگی، میری اپنی امی تو بس منہ تکتی رہ گئی تھیں ان کی ماں کا۔ کتنے زخم اس نے اپنے ہی ناخنوں سے نوچ کر ہرے کر لیے، کتنے زخم سوکھنے لگے تو کسی نے کھیرا۔

پھر وہ زخم تو بس رستا ہی رہتا تھا۔ جو شفقی نے لگا یا تھا۔ شفقی بھلا شند کا ہے کو شفقی اس کی۔ شفقی کی بھانج بننے سے قبل تو وہ خود شفقی کا دل تھی، گھر میں ساتھ کھیلنا، کھلے میں ساتھ کھیلنا، اسکول میں ساتھ پڑھنا۔ گھر وندے ایک ہکا مٹی سے بنتے۔ گڑیاں ایک ہی چوکی پر سجائی جاتی تھیں۔ کتاب کھو جاتی تو کلاس میں ایک ہی کتاب کے لفظوں کے دو نظریں مل کر گدگداتی تھیں۔ یہاں تک کہ بس سوئی کا دیا ہوا ہوم ورک ایک ہی تحریر سے دو علیحدہ نوٹ بکس میں کیا ہوا ملتا۔ اور اب گھر وندے بنانے والوں نے گھر بایلیے تھے۔ گڑیوں کی شادی کی خوشیوں نے بڑھ کر اتنے اندھیرے گہٹے منور کیے کہ خود اس کی شادی سے گھر کا چچہ چچہ چمک اٹھا، سلگ اٹھا۔ اور شفقی تو بس باولی ہو گئی تھی۔ میں اس کی نند نہیں ہوں جی۔ تمہاری سالی ہوں! وہ اپنے بھائی کو پھیرتی و سیب سے میمال کر دینا یا ب دیا ہے بھیا تجھے۔ ذرا سادل میں میل آئے گا تو میں حساب چکاؤں گی۔ نیند سے جگانا مت بھیا جی۔ سوتی کو اٹھانا مت جناب! شادی کے گھر کا جو حال تھا۔ وہی حال شفقی کے دل کا بھی تھا۔ ایک

ایک کی مدارات کرتی پھرتی۔ سنگن میں بھلھڑیاں پھوٹ رہی تھیں۔ توشقی کے دل میں لڑو پھوٹ رہے تھے۔

ایسی شقی نے بھلا جب یہ کہہ دیا کہ میرا بھیا تو ایک ایسا طوطا ہے جو بے ثمر کی شاخ پر رام بھروسے بیٹھا پھل پھول کا منتظر ہے۔ نہ خزاں معلوم نہ بہار کا پتہ۔ بس انتظار ہی انتظار۔ تو اس کے دل پر چوٹ لگی تھی۔

لیکن دن تھے کہ تہنیوں اور برسوں میں تبدیل ہو رہے تھے... سیولج کو نکلنے اور دوبنے سے مطلب۔ وقت کی ایک لمبی سی بکیر تھی جو پیچھے چھوٹ رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بکیر کو دیکھا جو ایک ناہموار راستے کی صورت میں اس کے سامنے تھی۔ پھر یہی راستہ ایک چٹیل میدان بن کر اس کے اطراف پھیل گیا۔ وقت کا ایک ایسا چٹیل میدان جس میں نہ کوئی اپنا تھا نہ پرایا۔ بس ایک ہو کا عالم تھا ایک سناٹا۔ اور اس سناٹے میں اس کا کچھ تھا تو اس کے زخم تھے۔ سوکھے سوکھے کبھی بہرے بھرے بھی۔ اس نے ان زخموں کی فصل کو اپنے آنسوؤں کا پانی دے دے کر سینجا۔

یہ آنسو بھی تو چپ چاپ بہہ نہیں جاتے ہیں۔ رنارہ کی شگفتگی، آنکھوں کی جوت، بدن کی تازگی سب اس ٹھارے پانی سے دھل کر اپنا رنگ روپ کھو دیتے ہیں۔

اس نے بھی اپنا رنگ روپ دھیرے دھیرے کھویا۔

جو اس کا تھا نہیں وہ اسے نہ مل سکا تو وہ بھی اس سے چھوٹنے لگا جو اس کا

اپنا تھا۔

شفی کے بھیا نے آخرش گورنمنٹ میں درخواست دے دی کہ انھیں دوسری شادی کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ ان کی موجودہ بیوی کے بطن سے سات سال سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہ تو خیر گوری جو سرکاری عہدہ دار ہونے کے ناطے شفی کے بھیا اس حد تک مجبور تھے درنہ جبٹ منگنی پٹ بیاہ — دیر کس بات کی تھی۔ اشر کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو بس ان کے بعد جائیداد کا وارث نہیں تھا۔

شفی نے پوچھا تھا ”بھیا دوسری شادی کے لیے حکومت کو درخواست دے رہے ہیں۔ تم بھی رضامندی ظاہر کر کے ان کی مدد کرو گی نا۔“ پلکیں چپک کر اس نے شفی کو اس طرح دیکھا تھا جیسے بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر نکا یک بوکھلا کر منس پڑی تھی۔ پگلی کہیں کی یہ کہی نہ سوچا کہ منسی تو پھر بھی منسی ہے۔ ہونٹوں کی ہو کر زخموں کی۔

خاندان بھر میں بات اس طرح پھیلی جیسے جلتی آگ پر کسی نے تیل چھڑک دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک مجرم ہے جس کے جرم کے خاندان بھر میں چرچے ہیں۔

لیکن ہمدردی کے دوچار لفظ جب بھی اس کے حلقے میں آئے۔ اس نے بھی یہ سمجھا کہ بعض ایسے بھی ہیں جو اسے مجرم نہیں سمجھتے اس کا مذمت سے نگوں سر کبھی کبھی اوپر اٹھا بھی تو بس اس سہارے کہ وہ بھوں کی نظروں میں مجرم نہیں ہے۔ دکھوں کی اس یورش میں جب کہ آسمان پر چمکنے والے ستارے ٹھنڈک نہیں پہنچاتے، چوٹ لگاتے ہوں۔

غم کدے جیسے اس چمن زار میں جبکہ کیلوں کی چمک سے زخم ہرے پھرتے
ہوں، پُردائی کے چلنے سے روح کا کرب جاگ اٹھتا ہو۔
اس نے ایک آواز سنی اور سونی نگرئی گونج اٹھی۔

میں آ رہا ہوں — میں آ رہا ہوں۔
یہ تخلیق کی راحت تھی جو کسی کی آمد آمد کا پتہ دیتی تھی۔

اس نے اپنے وجود میں ایک ہلکا سا ارتعاش محسوس کیا، اس نے اپنے
میں ایک اور زندگی کو کھماتے ہوئے پہچان لیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا بدن
اپنا کھویا ہوا رنگ، روپ پھر سے پا چکا ہے اور یہ سب کچھ بس دونوں ہی کی
تو بات تھی۔

برسوں کے سناٹے اس کی ہستی کے اس نئے شور سے ٹھکرائے اور سونی نگرئی
گونج اٹھی۔ اس نے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھا تو وقت کا پھیل میدان اب
ہری بھری کونپلوں سے جیسے پٹا پڑا تھا۔ ماضی کے کھنڈر میں بھی حال کی گونج سنائی
دے رہی تھی۔

اب کیا ہو گا؟ اس کی سانس نے سوچا۔ شفی نے بھی اپنی نئی بھابی تلاش
کر لی تھی۔ بات نہ صرف یہی ہو چکی تھی۔ بلکہ کچھ بڑھا دے بھی لے جائے جا چکے تھے۔
بس حکومت سے منظوری حاصل ہونے کی دیر تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ حکومت
کی جانب سے اس کا قلبی معائنہ بھی کرایا جائے گا۔

لیکن اب تو دیکھتے کہ دیکھتے کسی نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ آ رہا ہے اور اس
اعلان کی گونج جب اس کے دل میں مقید نہ رہ سکی تو چہرے پر تمازت بن کر پھیل گئی۔

وہ کب یہ چاہتی کہ لوگ اس کے ہنساؤں پر پھیلی ہوئی شفقت کی سرخی سے آنکھیں پھیر لیں۔

وہ کب یہ چاہتی تھی کہ اس کی سانس کی شفقتی شفقتی کے بھیا اس کی آنکھوں کی وہ بدلت دیکھیں ہی نہیں جس موت نے اس کے سارے کا سارا مستقبل منور کر کے رکھ دیا تھا۔

اپنے ہی من مندریں اس کو سچا کہ پیارے رکھنے کے اگر اس نے جتن کیے بھی تو صرف اسی لیے کہ خود اس کو کسی کی آمد آمد کا بھروسہ یقین ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ۔ لیکن نہیں۔ وہ تو آ رہا ہے۔ وہ تو آ رہا ہے۔

لیکن اب کیا ہو گا؟ اس کی سانس نے سوچا۔

شفقتی نے بھی اپنی نئی بھائی تلاش کر لی تھی۔

لیکن جب شفقتی کو یقین ہو گیا تو اس نے اپنے ننھے کے گالی پر چٹکی بھر کے کہا: "لو جی! ہتھ پائیے مامی اب ایک گڈ لاء ہے۔" اوں۔ آں۔ اوں۔ اور شفقتی نے اپنی بھائی کے پیٹ کو گڈ لاء کر کے اس کو خوب خوب ہنھایا۔ کھل کر ہننا کتنی بڑی نعمت ہے۔ آج اس نے محسوس کیا۔ زخموں کا قبرستان اب تو منہ بند کلیوں کا چین زار بن گیا تھا۔

شفقتی کے دل میں بھی سوئی ہوئی عورت انگڑوائی نے کر بیدار ہوئی۔

اپنی بھائی پر اس کو اتنا بہت سا پیار آیا۔ پیار جو محبت سے زیادہ جذبہ رحم کا نمائندہ تھا۔

بھیا دفتر سے لوٹے تو شفقی ان کی گردن میں باہیں ڈال کر بھول گئی۔
 ”لاؤ جی کو دو منہ میٹھا اور کل ہی اپنی درخواست حکومت سے واپس

لے لو۔“

بھیا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وہ بھی تو انھیں پتہ آگئی تھی۔ جس سے وہ اپنی زندگی کا ناٹھ استوار

کرنے والے تھے۔

”کیا لڑو منہ میں رکھ لیا ہے؟“ شفقی نے بھیا کو پھر چھپڑا تو وہ چونکے۔

”امی نے کیا کہا؟“ وہ کچھ اس طرح بولے جیسے خود کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

”اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے“ شفقی نے پھٹ سے جواب دیا۔

خاندان بھر میں یہ بات بھی انگٹناں میں بھری بہار کی تازگی کی طرح

پھیل گئی۔

کتنی ہی آنکھیں اس کی ہمدردی میں نم ہو گئیں۔ اشراف اکار سناڑ ہو۔

سائچے پادشاہ تیری دین نرالی ہے۔

شفقی کے بھیا حکومت کے ذمہ دار عہدیدار جو تھے۔ انھوں نے اپنی

درخواست واپس لے لی۔

اس کی ماں نے کہا ”یوسف شریف بابا کی درگاہ پر میں نے بھی عرضی

اسی روز چڑھا دی تھی، بیٹا جس روز تیرے میاں نے حکومت میں درخواست

دی تھی۔“

نیاز نذرانہ میں اس کی ماں نے دو ہزار صرف کیا، فیروں نے کھانا کھایا

بے کسوں نے کپڑے پہنے۔

اب تو اس کے اطراف سادھی نقصا چمک اٹھی تھی۔ چاند نکلتے کہ نہ نکلتے
بس سدا چاندنی ہی چاندنی اطراف میں بکھر گئی تھی۔

کھوئی ہوئی جوانی اٹے پاؤں آکر جیسے اس کے قدموں پر لوٹ گئی۔ اور
اس نے اٹھا کر اس کھوئی ہوئی جوانی کو گلے لگا لیا۔

کچھ دن تو یوں گزرے کہ ہر کھانے کی نعمت سے اس کی طبیعت ادب
گئی۔ اس کے باوجود جانے وہ کون تھا جو دنیا بھر کی صحت و سگفتگی اس کے حصے
میں لے آیا ہو۔

میں آ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں۔

اس آنے والے نئے جہان کی پذیرائی کے لیے اس نے اپنا بہت کچھ تھج
دیا تھا۔ بس دن رات اسی کے خیالوں میں مگن رہنے لگی۔

موزوں کے رنگوں کا امتزاج کچھ دل کو بھایا نہیں، جھٹ سے سوئٹر
بنا شروع کر دیا۔ لال اون کو سفید اور کالے اون سے جوڑ جوڑ کر دیکھا۔ سوئٹر
تیار ہو گیا تو پھر اسی رنگ کے موزے بھی بنے جانے لگے۔ کن ٹوپ تیار ہوا۔
پھر جرسی بنی۔ پھر پھرنے والی ٹوپیاں۔

شین پر چھوٹے بڑے بابا سوٹ سے گئے۔ فرامیں سلیس شفی نے
آکر گدگدایا اور چھڑو مشین پر دوڑنے ہوئے کپڑے سے نظریں اٹھیں،
سکرائیں، شرماکر جھٹکیں، پھر اپنے ہی تصورات میں گم ہو گئیں۔

شفی کے بھیا کو بھی اس کی دیوانگی پر ایک دن پیار آ گیا۔ جب کہ وہ

ڈھیر سارے کھلینے خرید کر گھر لوٹی تھی۔ کار کا دروازہ کھول کر جب انھوں نے سیٹ پر دیکھا تو بھینچنے بھی تھے۔ ناچنے والا بھالو بھی۔ دوڑنے والا موٹر بھی۔ گول چکر لگانے والی ٹرین بھی، گولے بھی، بینڈ بھی اور الم غلم کیا کچھ نہ تھا۔ ایک کمرے کو منتخب کر کے اُس نے ایک چھوٹی سی دنیا ہی سجادی۔ ایک کونے میں خوبصورت سا گودرنج کا پانا بھی، پلنگ بھی، ایک گوشے میں آئینہ لگی المادی۔ بچوں سیج چھوٹی سی میز، چھوٹی سی کوسیاں۔ کبھی تو وہ دن دن بھرائی کمرے کی تزئین و آرائش میں لگی رہتی۔ کبھی اپنے ہی خیالوں میں مگن وہیں فرش پر پڑی پڑی سو جاتی، کوئی خوابوں میں آکر اسے گدگد اجاتا۔

اس کو اپنے چھو لے ہوئے سیٹ پر اتنا پیار آتا کہ اس کا جی چاہتا کہ جلدی سے اس تھی سی جان کو جو اس کی ہستی میں سما گئی ہے جو اس کے سیٹ میں کبھی کبھی ملائی ہوئی ہوئی ہے باہر نکال کر سینے سے چمٹالے اور خوب خوب چومے۔

پھر ایک رات اس نے تخلیق کا کوب محسوس کیا.... پھر یہ درد اتنا بڑھا کہ اس کی شدت سے وہ نڈھال ہو گئی۔

ہاسپٹل میں جب اس کی آنکھ کھلی اور اسے ہوش آیا تو اس کے کانوں میں وہی آواز گونج گئی جو نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے لمحے بھر کو چونکا گئی تھی۔ اس کا بھولا بھولا پیٹ اب پیٹھ سے آگیا تھا۔ میرا تہاں کہاں ہے؟ اس کے دل نے خود اسی سے پوچھا۔ اس نے اپنے پاس دونوں جانب

دیکھا۔ وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

”وہ کہاں ہے۔ کہاں ہے میرا بچہ؟“

اس کی آنکھوں کے آگے اجالے اور اندھیرے گڈ بڑھ گئے۔ بڑی دقت سے اس نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو جنبش دی۔ شفقی کے بھیا اس کے پاس کھڑے تھے۔ پلکیں جھپکا کر اس نے یہاں سے کی کوشش کی۔ دھندلا دھندلا پہرہ واضح ہوتا گیا۔ نظریں ملیں اور شفقی کے بھیا نے منہ پھیر کر آنسو خشک کر لیے اور تیزی سے کمرے کے باہر نکل گئے۔

شفقی جو ان کے پیچھے کھڑی تھی، آگے بڑھی۔

اس نے بیتاب ہو کر شفقی کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔

”وہ کہاں ہے۔ کہاں ہے میرا ہانہ۔ میں نے اس کی آواز سنی

تھی۔ میں نے صرف آواز ہی تو سنی ہے۔ میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔ شفقی مجھے بتا دو۔“

لیڈی ڈاکٹر نے شفقی کو اس سے الگ کر دیا تو اس نے لیڈی ڈاکٹر کا ہاتھ پوری قوت سے دبا کر کچھ پوچھنا ہی چاہا۔ لیکن اس کی آنکھیں منہ نے نگین پھر اس پر غشی طاری ہو گئی۔

کچھ دن بعد جب اسے گھر لایا گیا تو وہ لوگوں میں گھری ہوئی بس سب کا منہ نکلے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں دور دور تک آنسوؤں کا کہیں پتہ نہ تھا ایک وحشت سی ضرورت تھی۔ جیسے یہ آنکھیں کسی کو تلاش کر کے مایوس اور خوف زدہ ہو گئی ہوں۔

رات کو جب شفقی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو بستر خالی تھا۔ وہ بھاگی بھاگی سیدھے اس کمرے میں گئی جو بچے کے لیے سجایا گیا تھا۔ روشنی جل رہی تھی اور کھلونوں اور سامان کو جھٹک جھٹک کر قرینے سے رکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بڑا مطمئن تھا۔ اس کی آنکھیں پرسکون۔

شفقی نے کواڑ کے اوٹ میں ہو کر اس کو سسر پیر تک غور سے دیکھا۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتی۔ کمرے میں ایک ایک شے کو صاف کرتی پھر رہی تھی۔

آخر ششفقی کمرے میں دبے پاؤں داخل ہو گئی۔ تب بھی اس نے نہیں دیکھا۔

شفقی نے کھانس کر اس کو مخاطب کیا تو وہ پلٹ کر ہمیشہ کی طرح مسکراتے لگی۔

شفقی نے دیکھا اس کا پیٹ بہت پھولا ہوا ہے جیسے نواں ہڈینہ ہو۔ اس نے گد گدانے کے انداز سے پھو کو دیکھا تو ساری کے اندر کپڑے ٹھنسنے ہوئے تھے۔

شفقی نے جب گد گدایا تو وہ ہمیشہ کی طرح شرما کر ہنسنے لگی۔ لیکن شفقی کی چیخ بھل گئی۔

اور پھر وہ پچھلے پاؤں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے تک بھی نہ پہنچی تھی کہ سبھوں نے اسے گھیر لیا۔

اس کے ہاتھ پاؤں سرد تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ بھابی۔

بھابی۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی تو انگلی اٹھا کر اس کمرے کی طرف اشارہ کیا
 جو آنے والے تھان کے لیے سجایا گیا تھا اور جس کی روشنی کھڑکیوں سے باہر
 نکل کر گھر کے صحن میں پھیل رہی تھی۔

خالی پٹاریوں کا مدارے

اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا۔ ابا
 تو بھی کیا میں پل بھر کو اس کے لیے ٹھہر سکتا تھا؟
 ”آنسو میں گرے کہ دامن میں جذب ہو۔ پلکوں سے پھوٹنے کے بعد
 نہ کہنے ہے نہ مونی“
 کیسی کیسی راحتیں تج کو عمر کی کشتی میں ڈالتے ہم کتنی مسافیتں طے
 کر لیتے ہیں۔ نہ پلٹ کر دیکھنے کی فرصت ہے نہ یاد ہی کر لینے کا یا را۔
 آج کوئی دامن پکڑ کر پوچھتا بھی تو نہیں جو شرم سے گردن جھک جائے۔
 اور کتنے ٹھٹھے سے میں گردن اٹھا کر چلتا ہوں۔ سراسر از سر بلند۔ لیکن سچ پوچھو
 تو ہم کہاں کہاں جا کر اس بیوا زندگی سے مصالحت کو لیتے ہیں۔

راحت کی عمر ہوگی چودہ برس۔ بالی سی عمر، گرٹیاں کھیلنے کے دن۔ کچھ سوچے بغیر نیند کی آغوش میں اپنا آپا تچ دینے کی راحتیں اور یہ لڑکی تجھے عمر کی اس منزل پر ملی جہاں ابھی ابھی میری میس بھگی تھیں اور اس کے لیے در پر چڑھ کر یکے شہوتوں سے اس کا دامن بھر دینا میرے لیے فخر کی بات ہوتا۔
اللہ یہ کچی پکی المیاں۔ راحت کا جی میرے ہوتے بھلا یوں ترس سکتا تھا۔

پتھر اٹھا کر درخت پر دے مارا اور لدی المیاں میں نے اس کے قدموں میں بکھیر دیں۔
اور ہم نے کتنی ہی کچر کچر جہا کر حقوک ڈالیں۔

برسات سے جل تھل ہوتے ہوئے میدان میں ایک دوسرے کو پھونکے اور پکڑنے کے لیے بھاگنا اور پھر ایک دوسرے کی دسترس سے بچنے کے لیے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر جانا۔ پانی کے پھینٹے اڑا کر کھیلنا اور پھر غور غور سے ایک دوسرے کے گیلے کپڑوں میں سے پھینتے ہوئے بدن کو بھانکنا۔
پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی لمبی لمبی گھنی سیاہ اور بھگی زلفوں کو اپنے ہاتھ پر پسٹ لینا۔

وہ گور ہی تھی اور جب میں نے اس کو پہلی بار سنبھالا تھا تو جسم کے کتنے ہی خطوط، کتنے ہی زاویے، کتنی ہی تویں میری آنکھوں میں بس کر رہ گئی تھیں۔
سنبھلنے کے لیے مجھ سے چٹی ہوئی جب وہ کنارے تک پہنچی تو گویا وہ بھی بہت دور نکل آئی تھی۔ میں بھی بہت دور اسے لے آیا تھا اور اب میں اسے رات

کے بجائے رات بیکار نے لگا تھا۔

اب میں اس کی گریبوں کے گھروندوں تک جا پہنچا تھا۔ اس کی ان پٹاریوں تک جا پہنچا تھا جن میں جانے کیا الم غلم وہ سو سو تختن سے چھپائے رکھتی تھی۔

پھر جیسے سب کو بھوڑ کر اس نے گھروندوں میں مجھے بایا۔
ان پٹاریوں میں مجھے چھپایا۔

کوٹ کا بلاگھا کر جب میں نے گیند پر بہت زور سے ہٹ لگائی تو یہ گیند مٹی کے اس گھروندے کو توڑ کر نکل گئی جو راحت نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔ لیکن اس نے کوئی پروا نہیں کی، نہ ہی میرا دل دکھا۔

میں ڈر کر اس کے قریب گیا۔ گیند کو میں نے بڑے پھینک دیا تو ہم دونوں مل کر دوسرا گھروندہ بنانے میں منہمک ہو گئے۔

گھروندے بناتے، مجھ ان میں باتے، پٹاریوں میں پہلے میرے تنھے پھر جیسے خود مجھے پھیلاتے، میری چوکھی گیند کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہکان ہوتے، جب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر گئی تو میں نے گر اگر کر سنبھالتے ہوئے کنارے پر لا کر اس سے پوچھا ایک بالکل نیا کھیل کھیلو گی؟
اور وہ شرمان گئی۔

پھر میں نے زیادہ چاؤ سے شہتوت اس کے دامن میں بکھیر دیے۔
کچی کچی اٹیوں کی بوتلیں اس کے سٹو میں ٹھونس تو اس نے زیادہ مزے لے لے کر کچر کچر چاڑا لیں۔ ہم نے یہ نیا کھیل جاری رکھا۔ اس کی آنکھوں کے رات

میں اس کے دل میں اترتا گیا۔ پھر اس کے بدن ہی کا ایک حصہ ہو کر رہ گیا کہتے ہیں خواہ آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔

اپنی بھوٹی سی عمر کی مختصر سی پونجی لے کر وہ جتنی تیزی سے میری زندگی میں داخل ہوئی اتنی ہی تیزی سے اپنا سب کچھ مجھ پر بچھا دو کر کے مجھ سے جدا بھی ہو گئی۔ جب وہ اپنا سب کچھ مجھ پر لٹا رہی تھی، اُس وقت نہ ہی میں نے جنم جنم کے لیے اس کا بورہتے کی قسمیں کھائیں، نہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کو یقین دلایا کہ اب اسی طرح اس کے قدم بہ قدم زندگی کا سفر پورا کر لوں گا۔

ہمارے بنگلے کے پیچھے ایک عالی شان محل تھا جس کے احاطے میں ایک خوبصورت سا جمن تھا جو اپنی رعنائی آہستہ آہستہ کھود رہا تھا، اس محل کے ایک حصے میں راحت اور اس کی ماں رہتے تھے۔ بنگلے کا تین چوتھائی حصہ منقل تھا۔ احاطے کے باغ میں جو بیرونی کمرے بنے ہوئے تھے اُن میں ایک مالی ایک مالن اور اس کے بچے رہتے تھے۔ چمن کی دیکھ بھال اور راحت اور اس کی ماں کے احکام کی تعمیل ان کے ذمہ تھی۔ اس کی ماں اسی بڑے گھرانے کی پروردہ تھی۔ گھر کی بیگم صاحبہ کو خوش کرنا۔ اپنی اٹی سیدھی باتوں سے ان کا دل بہلانا۔ اداس ہوں تو ہنسنا۔ ہنس رہی ہوں تو تہقہ لگوانا۔ تہقہ لگائے جائیں تو عمر بھر خوش رہنے کی دعائیں مانگنا۔ بس یہی کبھی اس کے فرائض تھے لیکن اب وہ بیگم صاحبہ رہ گئی تھیں، نہ ان کو ہنسائے کے جتن کرنے والے۔ راحت کی ماں بھی اپنی دی ہوئی دعاؤں میں تاثیر ڈھونڈتی رہ گئی اور آہستہ آہستہ جاگیریں ضبط ہو گئیں۔

راحت کی ماں نے بھی اچھے دن دیکھے تھے۔ ان کے میاں صاحب کے مہاج

تھے اور یہ تھیں بیگم صاحبہ کی منہ چڑھی۔ راحت کے آبا کو اللہ کو پیارے ہوئے کوئی تین سال ہو گئے تھے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کے وہ دن نہ رہے تھے کہ انھیں خوش رہنے کی دعائیں دی جاسکتیں۔

راحت کی ماں کو ماہ بہ ماہ پنشن برابر ملتی تھی۔ جاگیروں کی ضلعی کے بعد حکومت نے ان وظائف کو ایک لخت مسدود نہیں کیا تھا جو پہلے ہی سے منظور تھے سو انھیں ماہ بہ ماہ پنشن مل جاتی۔ اس کے علاوہ ضلع بھر میں راحت ہیرا ایل بہت مرغوب ہو گیا تھا۔ راحت کی ماں نے اپنی لاڈلی ہی کے نام سے جب یہ چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تو اسے کافی منافع ہوا اور واقعی ضلع بھر میں راحت ہیرا ایل گھر گھر میں تھا۔ ہمارے گھر نہ صرف اتنی وہی لگاتی تھیں بلکہ تحفے کے طور پر ہمارے چند رشتہ داروں کو جب انھوں نے شیشیاں شہزبجو امیں تو پھر ہر ماہ کچھ جانے کا انتظام بھی انھیں کرنا پڑا۔

راحت کی ماں بہتی تھیں کہ شیشیوں کے لیبل پر جس لڑکی کی تصویر ہے، وہ راحت ہی کی ہے۔

یہ دعویٰ نہ کبھی میری سمجھ میں آیا، نہ ہی میں نے کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ہیرا ایل کی تصویر میں اگر کوئی چیز راحت سے مشابہہ تھی تو میں لمبی لمبی لٹکھیں۔ پھر تو بالکل جدا تھا۔ اچھی خاصی بھرپور عورت کا۔ لیکن مجھے ان تصویروں سے بھلا لینا دنیا ہی کیا تھا۔ میں تو راحت کی ان لمبی لمبی گھٹی زلفوں میں منہ چپا کر جو راحت ہیرا ایل سے معطر رہتیں، اس سے کہا کرتا۔

"تم خدا کے لیے یہ تیل مت لگایا کرو رات۔ تمھاری زلفوں میں جب

منہ چھپاتا ہوں تو تمہارا یہ تیل میرے گالوں پر، میرے سارے چہرے پر لگ جاتا ہے۔ سوچو تو بھلا اگر میرے چہرے پر یہ لمبے لمبے بال اگ آئیں۔ پھر تو تم ہی ڈر کر میرے قریب نہیں آؤ گی۔ تب میں کیسا اکیلا اکیلا پھروں گا۔ بن رات کا چند اکہیں بھایا ہے۔ اور اس کی زلفوں میں منہ چھپا کر میں دیکھ بن بن کر اسے ڈراتا۔ گدگداتا اور وہ اپنے لمبے لمبے بالوں سے میرے ہاتھ ملا کر انھیں نہ سنجیدگی دیتی۔

کیسے کیسے کھیل اس مختصر مدت میں ہم نے درجا ڈالے۔ اپنا دامن پھیلا وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور میں نے نتیجے کے سبب ہی شاداب اور رنگین بھول توڑ ڈالے اور اس کا دامن بھر دیا۔ ان پھولوں کا اس نے جب بار بنا کر مجھے پہنانا چاہا تو میں نے بھٹ کر اس سے ہار چھین لیا اور اس کی لمبی سیاہ راتوں جیسی زلفوں میں گوند کر جیسے ~~میں گندے پانی سے تارے ٹانگ~~ دیے۔

پھر انہی سیاہ راتوں میں چھپ چھپ کر انھیں ستاروں کی چھاؤں میں میں کشتی ہی بار اس کا ہو ہو گیا اور وہ میری۔ ایک دن اس نے سر جھکا کر مجھ سے کہا۔

”مجھے اب کاسیاں سی آتی ہیں۔ میرا جی ادبنا رہتا ہے۔ مجھے وہ کچی المیاں توڑ دونا۔ اس سے پہلے کہ میں پتھر لے کر لدے ہوئے اٹلی کے درخت پر دے مارتا۔ میں نے راحت کا کرتا اٹھا کر اس کے پیٹ کو سہلایا۔ پھر ہلک کر چٹا چٹ پیٹ کو چومنے لگا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیا کرتے ہو؟“
 میں نے خوشی خوشی اس کی آنکھوں میں اترتے ہوئے کہا: ”اس میں
 میرا بچہ ہے لگی۔“
 اس کی آنکھیں پل بھر کو جگنوؤں کی طرح چمک اٹھیں۔ پھر صرف
 اس کی زلفوں کی سیاہ رات رہ گئی اور آنکھوں کے جگنہ جانے کہاں جا بسے۔
 میں اچھی خوشی سی تھا کہ وہ اس قدر اداس ہو گئی۔
 میرے سینے پر سر رکھ کر جب وہ سسکنے لگی تو سسکتے سسکتے اس نے
 پوچھا: ”اب کیا ہوگا؟“

اور میں سوچنے لگا واقعی اب کیا ہوگا۔ میں تو اس قدر خوش ہو ہاتھ
 راحت کی آنکھوں میں بھی جگنہ چمک اٹھے تھے۔ لیکن شاید یہ کوئی خوش
 ہونے کی بات ہی نہ تھی۔

میں نے اس کو دلاسا دیا۔ بھوٹ موٹ تسلیاں دیں۔ بہلایا منایا اور
 جب وہ کچھ مسکراسکی تو اس کو تھکد گردا کر ہنسا یا اور اپنی محنتیں بھوٹ م بھوٹ کر اس
 پر بچھا دے کہیں۔

میں سمجھ گیا تھا کہ میں اور راحت اب کچھ اور دنوں تک ایک دوسرے
 کے نشے میں چور نہ رہ سکیں گے۔ اب نہ میں اس کا دامن شہوت سے بھر
 سکوں گا نہ چین کے شاداب پھولوں سے اب نہ ڈھیر سی المیاں اس کے حکم پر
 مجھے توڑ لانا ہے نہ وہ اب میری بانہوں میں بھومتی ہوئی آنکھیں کچر کچر جیا کر
 تھکتی رہے گی۔

رُوح

پانی برسا کرے گا۔ میدان بھی جل تھل ہوں گے۔ سوکھے پھوسے پھر
سے بھر جائیں گے۔ ہریالی دور دوزخ تھل کی طرح کبھی رہے گی۔ نبویاں نکلیں
گی۔ خالی بھولا اس گھنے نیم کے پیڑ پر ہوا سے ہلکوارے کھاتا رہ جائے گا۔
مینڈک سرشام ڈر ڈر کرنے لگیں گے۔ میں اکیلا گھر سے نکلوں گا تو راحت قدم
قدم پر راستہ رکے گی۔ سنستی دڑتی اچھلتی بھاگتی مجھ سے چٹی میری باہنوں
میں بھولتی۔ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنی زلفوں سے زنجیر کرتی، تہقے لگاتی۔
پھر وہ ایک دم تھٹک کر رہ جائے گی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جکبند دم بھر کو
نکھکیں گے۔ پھر وہ گردن جھٹکا کر اداس ہو جائے گی، پھر وہ سسکنے لگے گی۔
میں اپنے تصورات کی دنیا میں اس کو کب تک اٹھائے اٹھائے پھروں گا ایک
دن، دو دن پھر میں کبھی شہر چلا جاؤں گا۔

دو دن گزر گئے۔ راحت نہیں آئی۔ جب میں سرشام اپنے مخصوص
راستوں سے ہو کر اس کے گھر پہنچا تو اس کے باغیچے کے پھول رو رہے تھے۔
کونٹے ہنس رہے تھے۔ عمارت کے اس حصے میں جہاں وہ رہتی تھی، مالین
دیا جلا کر رکھ رہی تھی۔ مالی نے مجھے بتایا راحت بی بی بہت بیمار ہو گئی تھی۔
اس کی ماں بہت پریشان تھی اس کو علاج کے لیے شہر لے گئے ہیں۔
میں لوٹنے لگا تو راحت جیسے کرتہ اٹھائے اپنا ننگا پیٹ میرے
سامنے لیے کھڑی تھی۔

”اس کو چومو اس میں مہتا ابچہ ہے“
راحت کی ماں امی کی بڑی چھٹی تھی، اس کی خوش طبعی، اس کے

آداب و تہذیب اس کے رکھ رکھاؤ کی اتنی دلدادہ تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے امی سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہو گا۔ میں نے کہہ دیا کہ بیکراچی سے بوجھنا چاہا لیکن انھیں تو اس کا بھی علم نہ تھا کہ راحت اور اس کی ماں شہر چلے گئے ہیں۔ مشکل آٹھ دن گزرے ہوں مگر کہ راحت کی شادی کے دعوت نامے ہمیں ملے۔ امی نے ٹیلی گرام کے ذریعہ راحت کی امی کو مبارکباد دی اور انھیں نیک تمنا میں بھیجیں۔

میں چپکے سے اس کے بلیغے میں پہنچ کر بہت سادقت وہاں گوارہ آیا۔

کالج کھل گئے تو میں بھی داخلہ لینے کے لیے شہر چلا گیا کیونکہ باقی اسکول میں پاس کر چکا تھا۔

کچھ ہی دن بعد آبا کا تبادلہ اس ضلع سے ہو گیا اور اس طرح راحت سے ملنے اسے دیکھنے، اس سے صرف ایک بار بات کر لینے کی تمنا بھی پوری نہ ہو سکی اور اس سے پہلے کہ یہ تمنا حسرت بن کر دل میں جاگزیں ہو جاتی، اپنی موت آپ مر گئی اور وہ اس طرح کہ مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا۔

میں ”رات“ کو بھول بھال گیا۔ عمر کی اس منزل میں جبکہ کالی راتیں جگاتے دنوں سے زیادہ پیاری ہوتی تھیں میں راحت کی سیاہ زلفوں میں اپنے ہاتھ کو کب تک نہ خیر رکھ سکتا تھا۔ کالج کے دن رات، سماں، چہل پہل، ہنسا، ہنسی، ہاں ایک تنہی سی یاد بھی جو دل کے کسی تار یک گوشے میں پھپھ کر رہی تھی، سسٹی بیٹھ گئی تھی۔ لرزاں لرزاں، ہراساں ہراساں۔ پیرے کی پٹاری میں

چھپی ایسی ناگن کی مانند جس کا زہر پھین لیا گیا ہو۔ پھن کھول کر سرنکال لینا تو آئے، پر ڈس کر تڑپانا بس میں نہیں۔

اور یہ بے ضرر ناگن کبھی کبھی اپنا پھن پیاری سے باہر اس وقت نکال لیتی ہے جب میرے خاندان میں کسی کو پہلو تھپکا بچہ ہوتا ہے۔ اور پھر خود ہی اپنا سر اندر کر کے چھپ رہتی ہے اور وقت اس پیاری کا منہ پر بھر میں ڈھنک دیتا۔ راحت مجھے اس وقت بھی یاد نہیں آتی۔ جب میں نے اپنی دلہن کا منہ گھٹا لٹا۔ میں تو پلکیں بھپکا کر چو دھویں کی اس چاندنی کا ہو رہا تھا جو میرے اطراف پھیل گئی تھی۔

ایک دن جب میری بیوی نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر نیچی نیچی نظروں سے مجھے بتایا کہ جی اچھا نہیں ہے۔ وہ مضحل مضحل سی ہے۔ اُسے ابکائیاں سی آتی ہیں۔ تو جھٹ کسی لڑکی نے کوننا پیٹ پر سے اٹھا کر مجھ سے کہا "اُسے چومو اس میں تمہارا بچہ ہے۔"

مجھے راحت سے جدا ہونے کے بعد پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ مداری کی پیاری میں چھپی ہوئی ہے ضرر ناگن کچھ اس طرح لہرا کر میرے سامنے آئی ہے کہ مجھے ڈس لے گی۔ پتہ نہیں کس نے اس کو اس کا زہر لوٹا دیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے گال چوم لیے۔ اس کا پیٹ نہ چوم سکا۔

تب میں نے اس ناگن کا سر کھل دینا چاہا۔ لیکن وہ بہت تیزی سے اپنی پیاری میں جا چھپی۔ جب میں نے پہلی بار اپنے منہ کو چوما تو اس ناگن نے لہرا کر پھر ایک بار سرنکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے پیاری کا منہ مضبوطی

سے بند کر دیا۔
پھر آہستہ آہستہ یہ ناگن مرگئی اور میں بھول گیا کہ کوئی غالی خالی پٹاری میں
نے اپنے دل میں چھپا رکھی ہے۔

آج بھرے میلے میں جب میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گھوم رہا تھا تو
کسی عورت نے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دور پر وہ کسی دوکان پر کھڑی اپنے بچوں کو
کھلونے دلا رہی تھی۔ میری بیوی کسی ہسپتال سے جو اسے ابھی ابھی ملی تھی بڑی پیاری
پیاری باتیں کرنے میں مگن تھی۔ آیا میرے بچوں کو پاس ہی کی ایک دوکان سے کھلونے
دلا رہی تھی۔ میں نے کُن آنکھوں سے پھر اس عورت کی طرف دیکھا جو مجھ کو دیکھ
رہی تھی۔

کسی اضطراب کا اظہار کیے بغیر خراماں خراماں جب میں اس کے قریب پہنچا
تو کوئی مانوس سا چہرہ اپنی چھب دکھلا کر سامنے آتے آتے چھپ گیا۔ پھر کسی لڑکی نے
اپنا دامن پھیلا کر آہستہ سے کہا اسے کچے کچے شہتوتوں سے بھر دو اور جب میں نے اس
بھر دیا تو اس نے سارے شہتوت میرے قدموں میں ڈال دیے اور اپنی سیاہ لمبی
رات جیسی زلفوں سے میرے دونوں ہاتھ ملا کر نہ بھیر کر لیے "اوہ۔ راحت"
وہ میرے پہچان لینے سے خوش ہو گئی۔

"لیکن رات تمھاری زلفیں۔۔۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔
اس نے دھیرج سے کہا۔ بے چاند کے کالی رات بھیا نک نکلتی تھی مجھے۔"
وہ راحت ہیرائیل کے لیبیل کی اس بھر پور عورت سے بہت۔۔۔ متاثر ہو گئی تھی جس
کو کبھی اس کی ماں راحت ہی کی تصویر کہا کوئی تھی اور آج اس کی وہی

سیاہ زلفیں نہ رہی تھیں جو اس تصویر سے کبھی اس کی وجہ مشابہت تھیں۔

میں نے حال احوال پوچھا۔

اس نے کوئی شکایت نہیں کی۔

پاس کھڑے ہوئے سات آٹھ سالہ بچہ کی باہنہ پکڑ کر میرے مقابل کھڑے

ہوئے پوچھا۔ اس کو پہچانتے ہیں آپ؟

الہم میں محفوظ اپنے بچپن کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی جسے دیکھ کر میری بیوی نے کہا تھا اس وقت بھی آپ اتنے ہی شرمیلے رہے ہوں گے جتنے آج ہیں۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بس اس کو دیکھتا رہ گیا۔ راحت نے پھر

پوچھا۔

”نہیں پہچانا آپ نے؟“

میں نے کہا ”یہ تو میں ہوں رات“

تو اس نے نظریں جھکا لیں اور بچے کو چٹا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”انھیں سلام کرو۔ ننھا سا سر خم ہوا۔ ننھا سا ہاتھ پیشانی تک اٹھا۔ اور میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

میری بیوی اپنی سہیلی سے رخصت ہو کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں نے راحت کا تعارف اس سے کرایا ”ابا کے زمانہ ملازمت میں یہ اور ہم ایک ہی ضلع پر تھے۔ اُمی میں اور ان کی والدہ میں بڑا بہنا پاتھا۔“

دو دنوں جانب سے ہاتھ اٹھے۔

میری نظریں خود ہی اس نچلے پر اٹھتی رہیں۔

میری بیوی نے بھی جب اس کو دیکھا تو اس کی نظر میں اسی کے چہرے پر ہم کو مرکز ہو کر رہ گئیں۔ اس نے بڑی مخصوص نظروں سے مجھ کو دیکھا۔ پھر مجھ کو دیکھ کر قریب کھڑے ہوئے کہنے لگی "کتنا پیارا سا ہے"

میں نے اس کی باتوں سے بوکھلاتے ہوئے کہا "چلو چلیں اب" جب ہم جدا ہونے لگے تو میں نے راحت پر بس اچھتی ہوئی تھکاؤ ال لی۔ اس سے نظر میں چار دن کو سکا اندر نہ بچے ہی کو دیکھا۔

جب ہم آگے بڑھ گئے تو میں نے کسی نہ کسی بہانے پلٹ کر بچے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے نظر نہ آیا۔ اور ایسے میں اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا "ابا" تو بھی کیا میں پل بھر کو اس کے لیے ٹھہر سکتا تھا؟ راحت کی آنکھیں لیکن میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔

میری بیوی نے کہا "وہ بچہ واقعی کتنا پیارا ہے۔ آپ کے بچپن کی وہ شریک تصویر ہے نا۔ ہو بہو اسی طرح۔"

"اچھا؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں نے غور نہیں کیا۔ تم نے وہیں بتایا ہوتا؟" وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی "بھلا ایسی بات میں وہاں کیسے کہہ سکتی تھی۔"

مجھے یوں لگا جیسے میری بیوی میرے دل میں پھنسی ہوئی بند پڑی کھول رہی ہے اور میں بھپٹ کر اس کا ہاتھ مختام رہا ہوں کہ اس میں ناگن ہے ڈس لے گی۔

لیکن پٹاری کھلی تو خالی تھی۔

اس میلے میں، اس چل پہل میں، اس گھاگھبی میں کوئی بھی تو نہیں تھا
جو میری خاموش پکار سنتا کہ میں خالی پٹاریوں کا مداری ہوں۔ کوئی ہے
جو میرا تماشا دیکھے۔

ہم سفر

طوفانی بارش تھی اور فرسٹ کلاس کے کپارٹ منٹ میں وہ اکیلی تھی۔

رات اس کی زلفوں سے زیادہ تاریک تھی لیکن کپارٹ منٹ میں جو روشنی تھی وہ اس کی منہسی کے سامنے ماند پڑ رہی تھی۔

آدٹ کی بین الاقوامی نمائش شروع ہو چکی تھی اور میں دلی جا رہا تھا۔ بارش سے شرابور جب میں کپارٹ منٹ میں داخل ہوا تو سوٹ کس رکھنے سے قیل ہی مجھے ایک نسوانی آواز نے چومکا دیا۔

”آپ تو سارا طوفان اندر لے آئے ہیں“ یعنی اس نے کپارٹ منٹ میں داخل ہونے کے بعد کچھ بھی مجھے سمجھنے کی ہمت نہیں دی۔ لیکن اس

کی طرف دیکھے بغیر اپنی موجودہ حالت درست کرنے میں مجھے عافیت نظر آئی۔
میں صرف اتنا جانتا تھا کیا رٹنٹ میں وہ اکیلی تھی۔

واقعی پانی بڑی تیزی سے میرے دائرہ پروٹ پر سے پھیل کر کیا رٹنٹ
کے فرش پر پھیل رہا تھا۔ میں نے دائرہ پروٹ اتنا کمزور دروازے کے قریب لگی
ہوئی کھونٹ سے ٹانگ دیا اور کنکھیوں سے اس کو دیکھا۔
وہ تو میری طرف ہی دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

میں نے بال درست کیے۔ بھک کر سوٹ کیس سے تولیہ نکالنا چاہا تو
سوٹ کیس غائب تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ درآں حالیکہ اس طرح تلاش
کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے تو بس آتے ہی سوٹ کیس ہمیں دروازے
کے قریب رکھ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ٹرین کے ساتھ جو پولیس کانسٹیبل ہے
اس کو مطلع کر دوں، لیکن سیٹی ہو چکی تھی اور ٹرین نے طوفانی بارش اور بھگڑاؤ
میں آہستہ آہستہ شروع کر دیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اپنے لائے لائے بال بھٹک کر خشک کرنے چاہے۔

اس نے تولیہ میری جانب بڑھا دیا۔ ”لیجئے“

میں نے شکریہ ادا کر کے تولیہ لے لیا اور بال خشک کرتا ہوا اس کو بہت

غور سے دیکھا وہ تو اس طوفانی سیاہ رات میں مدھم مدھم سا اجالا تھی۔ غضب
کا طبع چہرہ بہت ہی تیکھ نقوش۔

لیکن اس کی یہ بے تکلفی مجھے کچھ گوارہ نہ ہوئی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس

ہوا جیسے اس کی حبیب شخصیت اپنی کشش کھورہی ہو۔ بعض وقت خوبصورتی بغیر کسی پسند کے کتنی چھوٹی لگتی ہے۔

میں نے سرخنگ کو کہے تو لہ اس کو لوٹانے کے لیے ہانٹ بڑھایا، تو جیسے چونک گیا۔ یہ تو لہ بالکل میرا اپنا تو لہ ہے۔

اس نے میرے ہاتھ سے لے کر برتھ کی پچھلی سیٹ پر ٹانگ دیا اور ساتھ ہی میرا شکریہ بھی ادا کیا۔

میں نے کہا: "شکریہ آپ اس بات کا ادا کر رہی ہیں کہ تو لہ میں نے رکھ نہیں لیا ہے، لوٹا دیا ہے؟"

"تو کیا یہ بھی ممکن تھا کہ آپ رکھ ہی لیتے؟" اس نے میرے سوال کا جواب سوال ہی سے دیا۔ اب میں اس سے دیکھی لینے لگا تھا۔

"دنیا میں کیا چیز ممکن نہیں؟ میں نے گھسیٹی بات کر دی۔

"ممکن ہونے سے جائز تو نہیں ہو جاتی؟"

"اس نے پھر ذہانت کا ثبوت دیا۔"

"لیکن کون ان دونوں جائز اور ناجائز میں فرق کرتا ہے؟" میں نے دھاندلی کی۔

"تو آپ نے اسی جائز اور ناجائز کی تفریق مٹانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے؟"

میں ہنس پڑا۔ اس ہنسی کے پیچھے کوئی ایسا جذبہ بے اختیار تو تھا۔ نہیں ہو سکتا ہے کہ میں نے اس سے سمجھوتہ کر لینا ٹھیک سمجھا ہو۔ لیکن ایک بات

تو بالکل صاف تھی۔ وہ تو لہ میرا تھا جس سے میں نے سرخسک کیا تھا اور وہ یقیناً میرے سوٹ کمیس سے نکالا گیا تھا۔ اسی سوٹ کمیس سے جو میں ابھی ابھی یہاں رکھا تھا۔ جس پر میرا نام اور بحیثیت آرٹسٹ میرا پیشہ صد کچھ درج تھا اور جو اب غائب تھا۔

”آپ اپنے سوٹ کمیس کے کھوجانے کی اطلاع پولیس کو دینے کے لیے ٹرین کی زنجیر بھی تو کھینچ سکتے تھے۔“

اس نے جیسے بعد از وقت مشورہ دیا۔

”لیکن وہ کھویا کہاں ہے؟“ میں نے یہ جملہ کہہ کر جو رات سے کام لیا۔

”پھر ہو کیا گیا؟“ اس نے بھونچکا ہو کر پچھنے کی کوشش کی۔

”آپ نے عورت ہونے کے ناطے شاید یہ ذمہ داری اپنے سر لے

لی ہے کہ اپنے ہم سفر کی رکھوالی کریں۔“

”ہم سفر کی رکھوالی تو کی بھی جاسکتی ہے لیکن زاوراہ اور ہم سفر ایک

ہی تو نہیں ہوتے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو گویا آپ صرف میری رکھوالی کریں گی؟“

”وہ تو کو ہی رہی ہوں۔“

”کیا کہا آپ نے۔“

”تو لہ دیا تاکہ آپ بال خشک کر لیں اور آپ کی طبیعت ناساز نہ ہو۔“

”ہاں یہ تو سچ ہے۔ میں بھی کیا احسان فراموش ہوں۔“ میں نے کہا۔

”احسان فراموش بھی۔ سامان فراموش بھی۔“ اس نے پھر میری توجہ

سوٹ کیس کی طرف پھیر دی۔

”میں نے کہا تھا کہ میں — سامان فراموش نہیں ہوں۔
 ”یہ تو لیہ جو آپ کے پیچھے کھونٹی پر لٹکا ہوا ہے۔ اس بات کا شاید ہو کہ
 میرا سوٹ کیس آپ نے کہیں بہت حفاظت سے بھیا دکھا ہے۔“
 ”آپ میری خوش مزاجی اور زندہ دلی کا مذاق نہیں اڑا رہے ہیں بلکہ
 اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“

یہ جملہ ادا کرتے کرتے وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”آپ غالباً اداکارہ ہیں“ میں نے بے پردائی سے کہا۔
 ”جی نہیں“ اس نے کہا۔ ”میں تو آپ کی اداکاری اور کمال فن کی پرستار
 ایک تماش میں ہوں جو دیکھ دیکھ کر حیران ہوں کہ کس طرح پور پوری سے جاتا ہو
 لیکن ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔“

”بہت دلچسپ ہیں آپ — کہاں جا رہی ہیں۔ کیا کرتی ہیں؟“
 — میں نے پوچھا۔

وہ بغیر کچھ جواب دیے اٹھی اور اس نے سوٹ کیس سیٹ کے نیچے سے
 باہر گھسیٹ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔۔۔۔۔ ”یہی ہے نا، سوٹ
 کیس جس کی آپ کو تلاش تھی؟“

یہ سوٹ کیس میرے سوٹ کیس سے بہت ملتا جلتا تھا لیکن یہ میرا
 اپنا نہیں ہے — سوٹ کیس یہ بہت ہی واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا،
 ”ونو د چندر اما تھر“ آرٹسٹ

مجھ کو ذہنی اذیت سی ہوئی لیکن یہاں تو ایک عجیب ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنسو یہ کیا چکرتے ہیں۔ یہ اگر میرا سوٹ کیس نہیں ہے تو پھر میرا اپنا سوٹ کیس کہاں ہے اور یہ لڑکی مجھے آنسو کیا سمجھ رہی ہے۔

”آپ نے کیسے جان لیا کہ میں بھی آرٹسٹ ہوں۔“ میں نے پوچھا۔
 ”جاننا دانا کچھ نہیں ہے۔ اب آپ زیادہ جکڑ دینے کی کوشش نہ کیجئے کہ آپ کیا ہیں۔“

”پھر آپ نے مجھے میرے آرٹ کا حوالہ دیتے ہوئے ابھی کچھ دیر پہلے مخاطب جو کیا ہے؟“

”جی وہ تو طنز کیا تھا کیونکہ اس سوٹ کیس پر۔“

میں نے بات کاٹ دی۔ ”اچھا جی میں سمجھ گیا۔“ آپ مجھے چور یا اچکا سمجھ رہی ہیں، لیکن مجھ سے اتنا شریفانہ برتاؤ کیوں روا رکھا آپ نے۔“
 ”کوئی ضرور سی نہیں کہ میں سب کچھ آپ کو اسی وقت بتلا دوں۔ خیر صبر کیجئے اب اسٹیشن آ رہا ہے۔“

صاف ٹری کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ بارش تھم چکی تھی۔ میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ رات بالکل تاریک تھی اور کمپارٹ منٹ سے نکلنے والی روشنی باہر پھیلی ہوئی تارکیوں کے نرغے میں دم توڑ رہی تھی۔

ٹرین پلیٹ فارم پر رکی تو وہ اٹھی اور لپک کر اس نے دروازہ کھول لیا اور اتر کر سامنے ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ بے چینی سے کسی کو ڈھونڈ رہی تھی اور

ٹاکھیوں سے مجھے دیکھے جاتی تھی۔ میں نے دیکھا گاڑڈ اور پولیس کانسٹیبل اس کی طرف تیزی سے آ رہے تھے۔ اُس نے انھیں بتایا کہ اس کے اپنے سوٹ فیس کے چھوڑ کو اس نے خود کپڑا لیا ہے جو غلطی سے اس کے ڈبے میں سوار ہو گیا تھا۔ اور وہ میں ہوں۔

گاڑڈ نے مجھے دیکھا تو بے اختیار ہنس پڑا۔ میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے پولیس کانسٹیبل کو بریک سے میرا سوٹ کیس لانے کے لیے کہا۔ پھر اُس نے میرا تعارف میرے ہم سفر سے کرایا اور بڑی ہی لجاجت سے اس کی ملط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

کانسٹیبل میرا سوٹ کیس لے آیا تو کیا رٹمنٹ میں رکھنے کے بعد میری ہم سفر نے میرے نام اور پیشہ کو غور سے پڑھا۔ پھر یکایک خود کھلی جہتہ مار کر ہنس پڑی۔

میں نے اس سے معافی مانگی کہ میری وجہ وہ پریشان ہوئی۔ جب اس نے ہنس کر کہا کہ پریشان تو اب ہونا ہے اس لیے کہ گاڑڈ صاحب نے بتلایا کہ اس کی پارٹمنٹ میں اوپر کی سیٹ آپ کے لیے رزرو ہے۔ میں نے پیش کش کی کہ اس کو اس اکٹھن سے بچانے کے لیے میں کسی بھی بے میں بیٹھ رہوں گا۔

وہ مسکرائی۔ کہنے لگی۔

”جب آپ کو اچکا سمجھ بیٹھی تھی تو آپ سے انسانوں جیسا سلوک کیا، اب جبکہ آپ ایک شریف آدمی کی حیثیت سے میرے ساتھ ہیں تو بھلا آپ

کی ہم سفر رہنے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

گاراڈ نے سیٹی دی اندر ہم دونوں کو جنس کو خدا حافظ کہا۔

ہم ٹرین میں سوار ہو گئے تو میں نے اپنا سوٹ کیس کھول کر تولیہ نکالا اور اس کے آگے بڑھا کر اُس سے خواہش کی کہ اپنی نشانی کے طور پر اپنا تولیہ اس تولیہ سے بدل لے جس سے میں نے اپنے بال خشک کیے تھے۔

اس نے مسکرا کر تولیہ مجھ سے لیتے ہوئے کہا کہ واقعی اتفاق سے یہ یہ دونوں تو بالکل ایک سے ہیں۔

ٹرین روانہ ہوئی تو میں اطمینان سے اُس کے برابر بیٹھ گیا ظاہر ہے کہ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا بڑی معصومیت سے اس نے مجھے بتلایا کہ وہ مجھ سے بڑی خائف تھی اور ٹرین کے دوسرے اسٹیشن تک پہنچنے کے انتظار میں وہ بادل ناخواندہ مجھے رہجھا رہی تھی۔ اُس کے شریفانہ برتاؤ کا بس یہی ایک سبب تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اگر وہ صبح پکار کرے گی تو میں مزاحمت کروں گا اور پتہ نہیں اُس کے ساتھ کیا سلوک کر دوں۔ دو دو چند را ما تھر جس کا نام اُس کے سوٹ کیس پر لکھا تھا اس کے والد ہیں۔

ہم نے دلی تک یہ طویل سفر ساتھ ہی کیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ٹرین کی کہیں منزل ہی نہ ہو۔ مگر ہمارا ہی یہی منزل کا یقین نہ ہوا اور ہم چلتے رہیں، چلتے رہیں۔ وہ اس سفر میں مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔

اس کی شخصیت میں پندار کا وہ بھوٹا پن نہیں تھا جو مجھ کو اس کی اضطرابی کیفیت اور بوکھلاہٹ میں شروع شروع نظر آیا تھا۔ وہ

بڑی ذہین ملنار اور خلیق الطبع تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ زندگی کے سفر میں میری ہم سفر ہو جائے تو۔۔۔ !
لیکن میری زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ میں نے ایسی کوئی پیش کش کرنے کی جرأت نہیں کی۔

دلی اسٹیشن پر ہم جدا ہونے لگے تو میں بھی خاموش تھا وہ بھی خاموش تھی۔

میں نے اس سے دلی زبان میں کہا۔ میں نے تمہارا سوٹ کیس چرایا نہیں تھا، تم جان چکی ہو۔ لیکن تم جو میری زندگی کی ساری پونجی چور کر جا رہی ہو تو کیا میں تم سے شکایت بھی نہیں کر سکتا؟

اس نے نظریں جھکا لیں۔ پھر جدا ہونے تک آنکھیں چار نہیں کیں۔ میں ان بھکی بھکی نظروں کو دیکھ بھی نہ سکا۔

بہت سنبھل کر بڑے ہی اندرونی کوب سے اس نے کہا "ہمارے سماج میں کتنے ہی ہم سفر بڑی بے دلی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تقامے زندگی کا سفر طے کر رہے ہوں گے۔ میں بیاہتا ہوں۔ میری شاہی پھٹن ہی میں ہو گئی تھی۔"

میں نے سوچا اس کا باپ اتنا بڑا آرٹسٹ ہے۔ کتنی ہی تصویروں کا خالق۔ لیکن اس کی سب سے عظیم ترین تخلیق رور ہی ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نمائش کے لیے میرے اپنے بنائے ہوئے سارے پٹرٹ ڈھنڈلا گئے ہیں اور میں انھیں پہچان نہیں پا رہا ہوں۔

در دکارشتہ

تیسری ٹینگ میں جب گھوڑے اکثر بیٹ ایریاد - EXHIBIT AREA - میں لائے گئے تو میری نظر پانچویں گھوڑے پر جم کر رہ گئی۔ قد میں سب سے اونچا۔ ہاتھ پاؤں کا سب سے سیدھا۔ بونی بونی ٹھٹھکتی ہوئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پھونے سے کونٹ ہمارے جسم میں سرایت کر جائے گا۔ لیکن سارے میں باتیں ہو رہی تھیں "بے آف بنگال" کی۔ واقعی تھا بھی خوب۔ مگر میں تو بس - "فرینڈ شپ" کا ہو رہا تھا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

"فرینڈ شپ" کی گردن کے اوپری حصے میں گلے کے نیچے ایک گول سائیل کا حلقہ لگا ہوا تھا۔ دیکھنے میں ایسا لگتا جیسے لکڑی پر اسکر وے فٹ

کیا گیا ہو۔

میں نے سنا لوگ کہہ رہے تھے کہ اس گھوڑے کو سانس لینے میں تکلیف کا عارضہ ہے اور چھوٹا پتیل کا حلقہ اسی مرض کے ازالے کے لیے جو۔ وقتی طور پر سانس لینے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ لوگوں کا اعتماد اس "آرٹیفیشل بریڈنگ شپ" پر سے اٹھتا جا رہا تھا۔

میں ٹوٹ کھیلنے کے لیے کھڑکی پر پہنچا تو بڑے تذبذب کے عالم میں تھا۔ "فرینڈ شپ" کی دند پر بڑھوں یا "بے آف بنگال" کی؟ اس سے پہلے کہ میں قطعیت کے ساتھ کوئی اقدام کر سکتا میں نے ایک کمر پہلے دور واپے کا سوئچ خرید لیا۔ اس لیے بھی کہ اس اثنا میں مزید غور کر لوں۔

جی تو یہ چاہتا تھا کہ ٹوٹ کھیلنے کے بجائے کبیر پر کھیلوں۔ لیکن جیب سبک تھی اور اس وقت اتنی حیثیت نہ تھی یا بقول کمرشن چندر وہ انور ڈنہیں کر سکتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دل الگ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ عجیب بے دلی کا عالم تھا۔ میں نے اپنی اندرونی آواز کے زیر اثر جس کو آپ الفٹا (INTUITION) کہہ سکتے ہیں بڑھ کر "فرینڈ شپ" پر وین کا ایک ٹکٹ دند سے خرید لیا۔

رہیں شروع ہوئی تو فرینڈ شپ اسٹارٹ ٹو فینش (START TO FINISH) سب سے آگے تھا۔

مجھے یقین تھا کہ اچھا بھاؤ لے گا کیونکہ اس کی سانس لینے کی بیماری گئی لوگوں میں عام طور پر تشہیر ہو چکی تھی اور اس پر بیٹ کم لگائی گئی تھی۔ رہن جیت

کہ جب آپ پیسہ وصول کرنے کیلئے "ڈنر وڈو" پر پہنچتے ہیں تو ہر وہ پہرہ جو اس سمت آتا نظر آتا ہے وہ کچھ نا پسندیدہ سا لگتا ہے۔

اگلی ریس میں ایک گھوڑے نے دو آدمیوں کو پانچ پانچ روپے پر دو ہزار روپے فی کس دیے تھے۔ بھاؤ کا اعلان ہوا تو ہم ڈنر کو پانچ روپے کے ساڑھے آٹھ روپے ملے۔ یعنی ساڑھے تین روپے میری بھی حیت ہوئی۔ جی چاہا روپے بانٹنے والے سے کہوں کہ صاحبزادے باوجودیکہ تم اپنی عمر کے بچاؤ سال کھا چکے ہو، اپنے چار پانی کے خرچ کے لیے یہ سارے روپے دکھ لو۔ لیکن بس وہی بات مانع تھی کہ جیب بک تھی اوّل خالی خالی تھا۔ اپنا غصہ اپنی ہی بھولی میں محفوظ کرتا رہا۔

ساڑھے آٹھ روپے لے کر جب میں لوٹ رہا تھا تو عورتوں کی قطار میں تاجی مجھے اشارے سے بلا رہی تھی۔ "تاجی بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ بہت حسین۔ اپنا جسم بڑے سلیقے سے برتنی ہے اور حتی المقدور اپنے جسم کی صفائی کوئی ہے۔"

میں اس سے پہلی بار جس وقت ملا تھا تو بہت ادا ہو گیا تھا۔

اس کو تو کسی کے دل کی شہزادی ہونا چاہیے تھا۔

اس کو تو کسی کے گھر کی روتی ہونا چاہیے تھا۔

اس کو تو کسی کی زندگی ہونا چاہیے تھا۔ کسی کی روح۔ لیکن خود تاجی کی

اپنی نہ کوئی زندگی تھی نہ کوئی روح۔ جو کچھ تھا بس جسم اور چہرہ تھا۔ ایسا جسم اور چہرہ جو ہر کسی کی زندگی بن سکتا ہے۔ ہر کسی کی روح۔

میں تاجی کے قریب پہنچا تو اس نے کہا — ”میں نے فور کا سٹ بھی جیتا ہے۔ تم مجھے یہ پیسے بھی لا دو۔ بھاؤ اکھلی تک نہیں آیا ہے۔“ اس نے اپنا فور کا سٹ کا ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ تو میں نے اس کو مبارکباد دی اس نے گردن کو خم دے کر مبارکباد قبول کی اور کہنے لگی کہ وہ یہیں میری منتظر رہے گی۔

میں نے پوچھا — ”تم اکیلی ہو کیا؟“
 کہنے لگی — ”نہیں۔ سب بتاتی ہوں۔ تم ذرا پہلے ہو آؤ۔“
 ہری سادی میں لیوس تاجی قیامت معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا سبھاؤ اس کی سچ دھج۔ اس کی سجاتا۔ وہاں کے کھیت کی ایک تازہ اور ٹھنڈی لہلاہٹ تھی جو مجھ کو کمرہ گھمی تھی۔ کتنی ہی نظروں نے اپنے تانے بانے میں اس کو جکڑ رکھا تھا۔ لیکن وہ ان سب نظروں کو پہچان لینے کا گڑبانتی تھی کہ کون سی نظر کتنی دور تک اس کا ساتھ دے سکتی ہے۔

میراجی پھر چاہا کہ اس کو نظر بھر کر دیکھتا چلوں۔ سو میں نے اس کو دیکھا۔ وہ مسکرائی تو لوگوں نے مجھے دیکھا اور میں لمحے بھر کے لیے یہ بھول گیا کہ میری جیب بھی سبک ہے اور دل بھی خالی۔

فور کا سٹ دو گھوڑوں کے بریکٹ بنا کر کھیلنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً تاجی نے نمبرہ گھوڑے کو دین اور نمبرہ گھوڑے کو ”پلیس“ بنا کر کھیلا اور جیت گئی۔ فور کا سٹ کی جیت پر بھاؤ نسبتاً بہتر مل جاتا ہے۔

میں کھر کی پر پہنچا جہاں فور کا سٹ کی جیت تقیم ہو رہی تھی تو ایک

ازدحام تھا۔ میں سمجھ گیا کہ نمبر ۲ اور نمبر ۳ اکثریت کے پسندیدہ گھوڑے ہیں۔
 بھاؤ کا اعلان ہوا تو صرف اکیس روپے تاجی کے حصے میں آئے۔ یعنی ہرپے
 ٹکٹ کی رقم منہا کرنے کے بعد سولہ روپے اس نے فورکاسٹ پر جیتے تھے اور
 ساڑھے تین روپے دن پر جو وہ خود حاصل کرنے کے لیے کمیو میں کھڑی تھی
 جہاں میں اسے ملا تھا۔ اس طرح اس کے لگائے ہوئے دس روپوں کے علاوہ
 اس کو ساڑھے اسیس روپے مل گئے تھے۔ یہ رقم گو بہت معمولی تھی لیکن کیا
 معلوم تاجی کس عالم میں رہیں کو اس تک آئی تھی۔

میں پیسے لے کر اس مقام پر پہنچا جہاں تاجی نے بتایا تھا کہ وہ میری
 منتظر رہے گی لیکن تاجی وہاں نہیں تھی۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اس انتظار
 کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔

اس دن کی چوتھی رہیں ہونے والی تھی۔ لوگ بکیر اور ونڈوز کی طرف
 جوق در جوق بڑھ رہے تھے۔ میں کچھ طے نہیں کر سکا تھا کہ کس گھوڑے پر
 کھیلوں یا پھر اس بار کھیلوں بھی یا نہیں۔ اس مذہب کے عالم میں میں اگر میٹ
 ایریا کے قریب پہنچ کر گھوڑوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ عجب ایسی کا عالم تھا۔
 سامنے ٹہلنے والے گھوڑوں پر نظر تھی۔ لیکن دل و دماغ کہیں اور تھا۔ ”کوڈنی“
 اور ”البیلا بھلا“ کی بڑی تعریفیں تھیں۔ کوڈنی تھی بھی بڑی پیاری گھوڑی
 لیکن ”البیلا بھلا“ کی ہٹری بہت شاندار تھی۔ میں نے فورکاسٹ میں اس
 کو دن اور کوڈنی کو بیس رکھ کر کھیلایا۔

میں گھر سے چلا تھا تو تیس روپے میری جیب میں تھے۔ قرض خواہوں

کی پوشش سے بچا کر یہ تیس روپے یہاں تک لانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔
 آدمی مایوسیوں کے گھاٹوں پر اندھیروں میں جگنو کی چمک کو راستے کی روشنی
 سمجھ بیٹھے تو اس میں بھاری دل کا کیا تصور ہے۔ پاسبان عقل سا تھا نہ تھا،
 لیکن دل کو تنہا چھوڑنے کے یہ معنی بھی تو نہ تھے کہ غریب بھائیوں کو تنہا
 ویرانیوں کا ہوس ہے۔

میں نے تیس روپے میں قدم رکھا تھا تو چھ روپے داخلہ ٹکٹ کے صرف
 ہو گئے۔ اب صرف چوبیس روپے تھے۔ امیدوں کا ڈانڈ میرے ساتھ اس
 طرح چل رہا تھا جیسے اندھے لنگڑے بھکاریوں کا ایک غول میرے جلو میں تھوڑا
 امیدیں سورج کی پہلی کرن کی مانند دل کے تاریک گوشوں میں
 داخل ہوں تو خواہ کچھ حاصل ہو کہ نہ ہو جو صلے تو بڑھ جاتے ہیں لیکن یہی
 امیدیں اندھوں کی طرح دل کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھیں!

ہینے کی نوں تاریخ تھی۔ مجھے چالیس روپے تو عدالت خفیہ میں قرض
 کی پہلی قسط کے طور پر دسویں کو ادا کرنے تھے ورنہ تاریخ جی قرق لاکھ گھر کا
 سامان اٹھا سکتا تھا۔ مالک مکان کا کرایہ الگ ادا کرنا تھا۔ ساٹھ روپے بطور
 کرایہ مکان میں ہر ماہ پیشگی ادا کرنا آیا ہوں۔ ایک ماہ کا کرایہ بھی نافذ نہیں ہوا۔
 اس کے باوجود مالک کا اتنا تقاضہ تھا کہ جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر خود اسی کے
 دل میں جا چھپوں اور کچھ اس طرح گدگداؤں کہ اس کو مجھ پر ترس آجائے۔ چھپنے
 کے لیے یہ مقام میں نے اس لیے تجویز کیا تھا کہ اس کے سودا دنیا کے کسی خطے میں
 بھی جا چھپتا تو وہ مجھے میرے چھوٹے بچوں اور بیوی کی وساطت سے

ڈھونڈ نکالتا۔ لیکن یہاں جا پھپھتا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا گھر چھوڑ کر آسمان کے نیچے زندگی گوارنا۔

دودھ والی کے تقاضوں میں اتنی نرمی اور لچک رہتی جتنی نرمی اور لچک خود عورت کی فطرت میں رہتی ہے۔ یہاں بھونکی کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹنے کی بات ہی نہیں تھی۔ لوہا لوہے کو کاٹتا تھا اور بس۔ میری بیوی اس سے نمٹ لیتی ہے۔

تقصہ مختصر فوری طور پر ادا کرنے تھے ایک سو چالیس روپے اور گھر میں دھڑے تھے صرف تیس روپے۔ جو میں نے "البیلا پھیلا" اور "کو دنی" پر کھیل کر ہار دیے اور جو کچھ بچا تھا وہ سوئپ کی نذر ہوا۔

میں نے کہانی شروع کی تھی۔ ریس کو رس سے اور آپ کو بھل دے کر آیا ہوں اپنے گھر۔ کہاں ریس کو رس اور کہاں میرا گھر۔ گویا میں جنت کی سیر کر اٹے کر اٹے آپ کو جہنم میں گھسیٹ لایا ہوں۔ میں بورہ نہیں کو دں گا۔ یہ کہانی میرے گھر کا ہی کھاتا تو ہے نہیں کہ میں کہانی کے بہانے آپ کو اپنے قرض کی پائی پائی کا حساب بتا دوں۔ لیکن شکل یہ ہے کہ قرض کی ودیعت کو وہ اس اداسی سے ریس کو رس کی چیل چیل کا ماننا ضرور ہے۔ میرے گھر کے جہنم سے ریس کو رس کی جنت کا کچھ رشتہ سمجھی ہے۔ اور وہ ناتا رشتہ صرف اس قدر ہے کہ میں اپنی اس یادیں اور اداس زندگی سے بھاگ کر پہلی ریس ہی میں گھر کی ساری پونجی مبلغ تیس روپے لے کر آنکھیں بند کیے اس طرح کو داڑھا تھا جیسے کوئی ہندوستانی سپاہی اپنا گھرباڑ چھوڑ کر انگریزوں کی بقا کے لیے جنگ لڑنے کو محاذ پر چلا جائے۔

دیے ریس کو دس پر میں کئی بار جا چکا تھا لیکن ایسے تماشائی کی طرح
جو نہ کسی کے جلتے ہوئے گھر پر پانی کے دو چھینٹے دے سکتا ہے نہ بنتے ہوئے محلے
کی بنیاد میں ایک پتھر اپنے ہاتھ سے رکھ سکتا ہے۔ نہ کسی کے لٹ جانے پر ہمدرد
کا ایک لفظ، نہ بیکار بن جانے پر خوشی کا کوئی کلمہ۔

میرے ایک دوست تھے کمیٹی میں سود۔ وہ اپنی کپتانی مجھ پر اس
حد تک چلاتے تھے کہ میں ان کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ ہم
ریس کو دس پر داخل تو ہوئے بل جل کر گھر کے دوستوں کی طرح — پھر ایک
دوسرے سے جدا ہوئے تو دو دو گھنٹے ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوئی۔

میدان حشر میں سفتے ہیں کہ نومولود اور شیرخوار بچے بھی جو اس پھوٹی
سی عمر میں ماں باپ سے جدا ہو گئے تھے سو گئے کہ انھیں پہچان لیں گے۔ لیکن
ریس کو دس کے میدان میں ایسے ایسے کڑے وقت آتے ہیں کہ نوجوان بڑا ادھیڑ
باپ کو نہیں پہچانتا۔ نہ باپ بیٹے کو۔ چہیتی بیوی چاہنے والے شوہر کو نہیں
پہچانتی۔ نہ چاہنے والا شوہر چہیتی بیوی کو۔ لوگ گلے بھی ملتے ہیں۔ بھگڑتے
بھی ہیں۔ وہ جو ابھی دس منٹ پہلے آپ سے گلے مل کر گیا تھا۔ دس منٹ
بعد ہی سرنگوں و گوداں ملے گا اور وہ جس کو دنیا بھر کا مظلوم جان کر آپ
لائق توجہ نہیں سمجھ رہے تھے اس قدر بٹاش بکی کی جانب دوڑتا ہوا نظر
آئے گا جیسے خود جیتا ہوا گھوڑا ہو۔

بہاں منٹ بھر میں ہزاروں کے دارے نیا رے ہو جاتے ہوں۔
بہاں کھڑے کھڑے جیب کے فوٹیشن پن کیا ہاتھ کی گھڑیاں کیا کاریں تک

بک جاتی ہیں وہاں چوبیس روپے کی حقیر رقم اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے آج میں بھی ریس کو دس کی دنیا میں عملی طور پر حصہ لینے کے لیے شامل ہو گیا تھا اور کمپن مسودہ الزماں کو جمل دے کر آگ کی لپٹوں میں کود پڑا تھا کہ دیکھو نارا نرود گلزار منتی ہے کہ نہیں۔

اپنے دوست مسودہ کو جمل دینے کی ضرورت تھی اس لیے پیش آئی کہ اس کے اصرار پر بھی میں نے ہمیشہ ریس کھیلنے سے انکار اور گریز کیا۔ ادھائیہ تھا کہ بھری برسات میں آسمان کے نیچے کھڑا ہوں گا لیکن سر پر نہ بوند پڑے گی نہ اونٹے برسیں گے۔ آج یہ سارے دعوے باطل ٹھہرے اور مکان مالک اور تارا احمد ولد برج جی نے دل کو ہلو کر کے رقص میل کے لیے ریس کے میدان میں مجھے پھینک دیا۔ لیکن تابو ایک مل گئی تو میں نے سوچا — دلے نازم بہ این فتنے کہ پیش یار می رقص۔ لیکن وہ انتظار کرنے کے لیے کہہ کر ایسی گئی کہ کوئی نہیں امد میں ریس کو دس کے اس محشرستان میں پھر تنہائیوں کا ہو کر رہ گیا۔

چوتھی ریس اسی تذبذب کے عالم میں میں نے کھیلی تھیں۔ میں دو روپے کا سوپ لیا اور ہار بیٹھا۔ جب میں پلیٹ پر لگے ہوئے سوپ کے بنروں سے اپنے ٹکٹ کا بنر ملا کر دیکھ رہا تھا۔ میرے برابر کھڑا کوئی آدمی یکا یک پیچ پڑا "اے بھگوان" اور دھوٹی سیٹھاتا ہوا بگٹ بھاگنے لگا۔ میں نے دو جھٹ میں اس کو قریب قریب جیسے دبوچ لیا۔

"ذرا سہی تو بتاؤ کہ کیا ہوا؟" میں نے اضطرابی کیفیت میں پوچھا۔ ایک بھٹکے سے اس نے باہر نہ چھڑائی — پہلا نمبر آیا ہے جی — بھگوان کی

کر پائے۔" الفاظ اس نے دوڑتے دوڑتے ہی ہانپ کر ادا کیے۔ میں نے ٹھہر کر دیکھا تو اس کی دھوٹی پیروں میں اس کو کھل گئی تھی اور وہ بھاگتے ہوئے ہی اس کو براہ کیے جا رہا تھا۔ تن و توش سے کوئی سیٹھیا معلوم ہوتا تھا۔

سوئپ کی تختی پر پہلے منبر کے محاذی بارہ سوپا لیس روپے کا فیکر جیسے میرے منہ پر تھوک رہا تھا۔ اے بھگون بڑی کر پائے، اے بھگون تیری لیلہ۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ساجی نے جیچھے سے میرا ہاتھ دبایا اور اس سے پہلے کہ میں مڑ کر اس کو دیکھتا وہ خود میرے مقابل آگئی۔

"کہاں تھیں تم ملیں کیوں نہیں۔ مجھے انتظار کر دیا۔"

اس نے کہا "معاف کر دو مجھے" اور میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس کے اس پیار بھرے انداز سے میں نے بھائیں بھائیں کرتے دل میں کسی کے نازک اور نرم قدموں کی چاپ سُنی۔

"تم اکیلے ہو تو میرے ساتھ رہو" میں نے یہ اصرار کیا۔

وہ میرے ہاتھ چھوڑ کر میرے بھولین پر منہس پڑی۔ کہنے لگی۔

"تو کیا میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ اٹھلی رہا کروں؟"

میں شاید اس کی انانکی خوبصورتی پر منہس سکتا تھا۔ لطف اٹھا سکتا تھا مگر ابھی ابھی میں نے اپنے دل میں جن قدموں کی نرم و نازک چاپ سُنی تھی ابھی قدموں نے گویا مجھے ٹھوکر لگائی اور میں خود پر ترس کھا کر رہ گیا۔

اس نے پھر میرے ہاتھ تھام لیے، لیکن میں نے اس بار اپنے دل میں کوئی آواز نہیں سُنی۔

وہ بچوں کی طرح پچکا کر کہنے لگی۔ "میں اس وقت بڑے موٹے اسامی کے ساتھ ہوں۔ وہ کین ٹین کے کاؤنٹر پر کھڑا بیر کا بائل غدار رہا ہے۔ ادھر دو ماہ سے مجھ پر بے دریغ خوج کرتا رہا ہے۔ آج مگر بچا رہ بہت ہار رہا ہے۔ جیت لیتا تو میرے بھی ٹھاٹھ ہوتے۔ سب کچھ ہار چکا ہے۔ ابھی دو دوڑیں باقی ہیں نا۔ میں اسی کے لیے رقم فراہم کرنے کی فکر میں باہر جا رہا ہے۔"

"باہر جا رہا ہے تو اس کو پھوڑ کر یہاں چلی آئی ہو؟" میں نے طنز کیا۔ لیکن تاباجی نے مسکرا کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے جان گئی ہو کہ میں بچے کی جند کر رہا ہوں۔ اس نے میری بات کا بالکل برا نہیں مانا۔ کہنے لگی "کسی کی ہار جیت کے ساتھ میرے جسم و جان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

پھر اپنی ہتھیلی کھول کر میرے آگے اس نے پھیلا دی اور اپنے دوسرے ہاتھ سے میرا ایک ہاتھ تھاما، اسے اٹھایا اور اپنے کھلے ہونٹ ہاتھ پر دوران گفتگو میں لاتی رہی۔ اس کی چاہت کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ اس کے پیار کے انداز اذیت کے اپنے بھائیں بھائیں کرتے دل میں پھر کسی کے قدموں کی چاپ میں سنسنے لگا ہوں۔

"تو تم اس کے ساتھ نہیں جاؤ گی؟" میں نے بے صبری میں جان لینے کے لیے کہہ کر وہ میرے ساتھ رہے گی۔ پوچھا۔

"وہ خود مجھے یہاں پھوڑ کر جا رہا ہے تاکہ میں بوڑھے کاؤنٹ ہارٹن کی تلاش کر کے کسی نہ کسی طرح اس سے ملیں۔"

میں سمجھ گیا۔ بوڑھا کاؤنٹ ہارٹن بہت ہی مشہور پونٹر (PUNTER) تھا۔

لوگ ایسے وقتوں میں اکثر اس کی ٹپ لے کر کھیلنے کے لیے اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ کبھی جیت بھی ہوتی کبھی ہار بھی جاتے۔ ہوتا وہی جو بہر حال ہوتا ہے۔ لیکن ڈوبتا تو تنکے کا سہارا ابھی ڈھونڈتا ہے نا!

”چلو“ اس نے میری بائیںد کپڑے کر کہا ”کاؤنٹ ہارٹن کو ڈھونڈیں“ ہم دو چار قدم بڑھے تھے کہ اس نے مجھے اشارے سے بتایا ”وہی ہے جس کے ساتھ میں ہوں“

ایک بھاری بھر کم میکن شیکل سا نوجوان گرے رنگ کا فٹ سوٹ پہنے کینٹین سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کی نظروں کی بے چینی بتا رہی تھی کہ وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ تاجی نے میرا ہاتھ دبا کر کہا ”وہ میری تلاش میں ہے“ اور اس نے جھٹ سے اپنی پرس کھول کر کچھ فوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھا کر کہنے لگی۔

”انھیں بھی رکھو۔ اگر میں ان دو درمیوں میں بھی تمھیں نہ ملوں تو خواہ کتنی ہی دیر ہو تم یہیں بائریگیٹ پر میرے منتظر رہنا“

اس نے پرس کا زپ بند کیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھ سکوں اپنا خالی پرس ہلاتی ہوئی اٹھلا کر تیز تیز قدم اٹھاتی نوجوان کی طرف چل دی۔ اس کے ہاتھ میں خالی پرس مجھے اس طرح لگا جیسے اپنے سینے میں میرا اپنا خالی خالی دل۔ میں ان دونوں کو باہر جانے والے گیٹ کی طرف جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ نوجوان اور تاجی میرے قریب سے گزرے تو تاجی نے بڑے باتکین اور رکھ رکھاؤ سے مجھے سلام کیا۔ جیسے ابھی ابھی مجھ سے مل رہی ہو۔ میں نے دیکھا

بھاری بھر کم فوجوان کچھ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ اس نے تاجی کے اور میرے
پیام و سلام کو کچھ اہمیت نہ دی، نہ نظر اٹھا کر مجھے دیکھا ہی۔ اس کی سوٹیڈ
بوسٹیڈ شخصیت میں ٹاٹ کا پیوند لگانے والی اس کی ہیرے کی بالیاں تھیں جو
اس نے کانوں میں پہن رکھی تھیں۔ یہ نہیں ان بایوں کو دیکھ کر اس کی جاؤب نظر
شخصیت تجھے کیوں کچھ پھوٹی پھوٹی سی کچھ معمولی معمولی سی نظر آنے لگی۔

وہ گیٹ سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا تاجی ہاتھ ہلا کر واپس لوٹ رہی ہے
وہ بڑی فاتحانہ چال چل رہی تھی۔ ایسا خام ناز جو کبھی حسن کا پندار بن جاتا ہے۔
میرے قریب آکر اس نے کہا۔

”چلو پھٹی ہوئی“

”کیسی پھٹی؟“ میں نے سوال کیا۔

”اب میں نہیں سمجھتی کہ وہ آخری دوڑ سے پہلے آئے گا بھی۔“

”کیوں نہیں آئے گا؟“ میں نے پھر سوال کیا۔

”رقم جو فراہم کوئی ہے اس کو۔ بٹک بند ہو چکے ہیں۔“

”کانوں میں ہیروں کی بالیاں جو ہیں۔ سوکس دن کے لیے ہیں؟“ میں

نے پوچھا۔

”وہ تو منت کی ہیں۔ کاشی میں اتریں گی۔ میں کو دس پر نہیں۔“

تاجی نے مجھ پر بھی بتایا کہ ہیرے کی بایوں والا فوجوان دل کا بڑا ہنسی۔
”لیکن ہارتا ہے تو جینے کی توقع میں پاگل ہو جاتا ہے۔“ اُسے ساتھ لے جانا چاہتا
تھا لیکن اس نے کاؤنٹ سے ٹپ لینے کا لالچ دے کر اپنا پنڈا پھڑالیا ہے۔

”لو ————— تم یہ اپنی امانت سنبھال لو“ — میں نے پیسے اس کی طرف بڑھائے۔ اور اس کی بات کاٹ دی۔
 ”نہیں — نہیں — ابھی یہ اپنے ہی پاس رکھو۔ میں ان کا مصرف تمہیں بتاتی ہوں۔“

”کتنے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”بس چورافے ہوں گے، اس نے بتایا۔“
 میں نے وہیں گن کر دیکھا۔ پہلے بھی اس نے اکتیس رکھو اے تھے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اور اپنی جیب میں محفوظ کر لیے۔
 ”اپنے ساتھی سے پیسے چھپاتی ہو کیا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں۔ ورنہ وہ یہ بھی رئیس میں ہار دے گا۔“ میں خود تھیں سب کچھ بتانا چاہتی ہوں لیکن تم صبر بھی کر سکو۔“
 مجھے اس پر بیاہ آیا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔
 آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے ہونٹوں کو چوم کمرہ گیا، اس لیے بھی کہ یہاں کتنی ہی نظروں نے ہمارے اطراف جال سا بن رکھا تھا اور اگر یہ جال نہ بھی ہوتا تو۔

تاجی اپنا جسم بڑے سلیقے سے برتنی ہے اور حتی المقدور اپنے حسن کی حفاظت کرتی ہے۔

— وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے — بہت حسین۔
 اس نے یکایک میرا ہاتھ پکڑ کر کہیں مین کی طرف گھیسٹے ہوئے کہا۔

”چلو پہلے کچھ کھائی لیں۔ پتہ نہیں کھد سٹ کاؤنٹ وہیں مل جائیں۔“
 ہم کین میں کی طرف مڑ گئے تو میں نے پوچھا۔
 ”اس دور میں کسی گھوڑے پر کچھ نہیں لگاؤ گی؟“
 ”بالکل نہیں۔۔۔ اب آخر تک کسی دور میں کچھ نہیں لگاؤں گی۔“
 اسی روپے مجھے اپنے بھائی کو دینے میں درندہ امتحان میں بیٹھنے کے حکم
 میں جانتا تھا ساجی کا ایک بڑا بھائی تھا جو یونیورسٹی میں ڈگری کرنا
 کر رہا تھا اور یہ اس کا آخری سال تھا۔
 ”تم چاہو تو کھیلو۔“ اس نے جیسے چونک کر کہا۔
 میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے خود ہی
 پوچھا۔ ”کتنا ہار گئے ہو؟“
 ”کتنا جیت گئے ہو پوچھو۔“ میں نے اپنی شان استغنا بتلائی۔
 ”تم اسی طرح جیتتے رہے ہو۔“ اس نے میری باہنہ میں جھٹکی بھری اور
 ہم دونوں دن بھر میں پہلی بار کھل کو ہنس سکے۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے کہا ”مجھے
 کیا پلاؤ گے؟“
 اور میں نے اس طرح تڑپ کر اسے دیکھا جیسے میری جیبیں بھرے بازو
 میں اس وقت الٹ کر رہ گئی ہوں جبکہ میں چیز پز کر کے بھاؤٹے کر رہا تھا۔
 ”میں سب جانتی ہوں۔“ اس نے مجھ سے بہت قریب ہو کر مجھے گدگدایا
 جیسے میرے احساسات کی جو اہتیں سیٹ کو اطراف ہنسنے والوں کے منہ پر دے
 مائے گرا۔

میں اس کی خاطر مسکرا سکا اور اس سے نظریں چار کیں۔
 مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں نے میری آنکھوں کو چوم لیا ہے۔
 ”تم اپنی پسندیدہ بیئر پیو۔“ اس نے پیش کش کی۔
 میں انکار کر گیا۔

”پینا پڑے گی۔ میں اتنا ہی خوج کر دوں گی۔ جتنا میں کر سکتی ہوں تم
 مطمئن رہو۔“ اور اس نے گولڈن ایگل بیئر کا آؤڈر دے دیا اور اپنے لیے کوئی
 دو قسم کی آئس کریم منگوائی۔

میں نے آئس کریم کی اتنی دیر انی کرہ کی نہیں دیکھی — برف گرہی
 ہو۔ آپ آئس کریم اس کی طرف بڑھا دیجئے۔ وہ بڑی شریذ نظروں سے آپ
 کی طرف دیکھے گی — پھر وہ نظریں جن کے دیکھنے سے ایسا لگے جیسے اپنی
 ہماری ہستی ڈول رہی ہو بڑی مہذب دکھائی دیں گی۔

میں نے بیئر کا گلاس بھرا ہی تھا کہ اس نے جھک کر مجھے قریب ہونے
 کا اشارہ کیا۔ وہ میرے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کی طرف جھک
 گیا تو اس نے کہا۔

کچھ دیر تو قف کر کے ذرا اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھنا۔ یہ صاحب بہت دیر
 سے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔“

”تمہارا تعاقب تو یہاں کتنی ہی نظریں کر رہی ہوں گی اور وہ نظریں
 ہی کیا جو تمہارا تعاقب نہ کریں۔“

وہ کہنے لگی — ”یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ کون سی نظر کتنی دور

تک میرے ساتھ چل سکتی ہے۔"

"تو کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ نظریں دور دور تک بھارا ساتھ دیں گی؟"

"دور دور تک نہیں بس کچھ ہی دور تک اور یہی غنیمت ہے۔"

میں نے ہلٹ کر دیکھا۔ اور جیسے میرا خون کھول کر رہ گیا۔ وہ تو ہمارے گھر کا مالک تھا۔ ہمارا لیتل لارڈ۔ ساٹھ کے پیٹے میں دوسری ہڈی کا آدمی۔ میں نے فوراً منہ پھیر لیا۔

تاجی بڑی تیز لڑکی ہے۔ وہ میری نظروں سے تار لگتی کہ اس شخص کو نہ صرف یہ کہ میں جانتا ہوں بلکہ ناپن بھی کرتا ہوں۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" میں نے کہا۔ میں انھیں جانتا ہوں۔ بڑے اصول پسند

آدمی ہیں۔ میں انھیں کے ایک مکان میں کرائے پر رہتا ہوں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔"

"میں نے صحیح سمجھا تا کہ یہ نظریں دور دور تک میرا ساتھ دے سکتی ہیں؟" تاجی نے مجھ سے استفادہ کیا۔

"میں نے ایسا کوئی علم نہیں پڑھا ہے۔" میں نے خستہ انت سے کام لیا۔ جس کا مجھے فوری دُکھ بھی ہوا۔ لیکن میں کچھ ایسے ہی موڈ میں تھا کہ دل توڑ کر غم نہ کروں۔ ادویوں گزرجاؤں جیسے یہ ابھی ابھی جو ایک چھنا کا سامیرے کانوں سے ٹکرایا ہے۔ وہ راستے میں پڑے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے سے کسی بیر کے پھو جانے کا چھنا کا ہے۔

منٹ بھر کے لیے ہم دونوں پر خاموشی طاری رہی۔
 مجھے محسوس ہوا تاجی نے بہت اثر لیا ہے۔
 ”غصے میں کبھی آئینہ دیکھا ہے؟“ میں نے مصالحت کرنے کے لیے

پوچھا۔

”وہ آئینہ نہیں دیکھا جو بڑی بے دردی سے تم دکھاتے پھرتے ہو۔“
 میں دل موس کر رہ گیا اور نظریں جھکا لیں۔
 مجھے خاموش دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں
 نے اس کے باوجود نظریں چار نہیں کیں تو اس نے چیمہ بھر کر آئیں کو میرے
 ہاتھ کی پشت پر ڈال دی۔

میں نے اس کو دیکھ کر کہا: ”معاف کر دو مجھے۔“
 وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے اتنی زخمی مسکراہٹ زندگی میں کا یہ کو
 دیکھی ہوگی۔ لیکن میں تو مسکرا بھی نہ سکا تھا۔ تاجی مجھے سہارا دے رہی تھی۔
 جیسے میں زندگی کے ناہموار راستے پر منہ کے بل گر پڑا ہوں۔

”لاؤ مجھے آئیں کو یم کھلا دو۔“

میں نے اپنے ہاتھ کی پشت جس پر سے اب آئیں کو یم گھیل کر بہنے لگی تھی
 اس کی جانب بڑھا دی تو اس نے اپنے ہونٹ اس پر رکھ دیے۔ آئیں کو یم کھا
 چکی تو آہستہ سے مجھے کاٹ کھایا۔

میں منہس پڑا تو مجھے ہنسا دیکھ کر بہت خوش خوش نظر آئی۔
 میرے ہاؤس ادنیٰ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو گا۔ مجھے

تسکین سی ہوئی۔ میں سیر پی چکا تو اس نے کہا۔

”چلو پینکج کو دیکھتے ہیں“ اس نے بتایا کہ پینکج اس کے اسی ساتھی کا نام ہے۔ میں اس طرح اٹھ کر کین مین سے نکل آیا جیسے اپنے مالک مکان کی موجودگی سے واقف ہی نہیں ہوں۔ تاجی نے بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ہم پینکج کا اس کے بتلائے ہوئے مقام پر انتظار کرتے رہے۔

لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ایک فلوک گھوڑے نے اس دوڑ میں بہت غیر متوقع بھاؤ دیتے ہیں۔ میرے دل پر یہ باتیں جیسے تیرن کر لگ رہی تھیں لیکن میں نے تاجی کو اس کا احساس ہونے نہیں دیا۔ آخری دوڑ کے شروع ہونے کا وقت بھی قریب آیا لیکن پینکج نہیں آیا۔

تاجی مجھ کو مضطرب سی نظر آنے لگی۔ اس کا یہ اضطراب مجھے پھر سنجیدگی اور خاموشی کی طرف لے چلا۔

”پینکج کے لیے بیقرار ہو؟“ میں نے چوٹ کی۔

اس نے تڑپ کر تجھ دیکھا۔ ”ہو بھی سکتی ہوں۔ تمہارے لیے بیقرار ہونے سے تو رہی۔ کبھی کبھی مل جاتے ہو تو تمہارے ناز بھی اٹھاتی ہوں۔“
مختص تو دکھ پہنچانے میں مزہ ملتا ہے تم اور دے بھی کیا سکتے ہو؟
تاجی تجھے چوٹ کھائی ہوئی ناگن نظر آئی۔

لیکن اس ناگن نے مجھے اس طرح ڈس لیا تھا کہ میرا جابز ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کی حق گوئی۔ اس کی صاف گوئی سے میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔

میں نے پہلی بار اس کو منانے میں پہل کی۔ سنس کو میں نے اس کو گدگرایا

”آج تم ذل کھول کر مجھ پر خفا ہوئی ہو۔ میں تمھارے ضبط کو آزماتا رہا ہوں۔ جیت ہمیشہ تمھاری ہوتی ہے، لیکن آج میں اس لیے خوش ہوں کہ میری جیت ہوئی۔“

”میں تو ہمیشہ ہی ہارتی رہی ہوں۔ لیکن اس ہار جیت میں دھرا ہی کیا ہے۔ پل بھر کو ملنے والے مسافر جیت جائیں تو کیا۔ ہار جائیں تو کیا۔“

”بہت سمجھ دار ہوئی جا رہی ہو۔“ میں نے پھر اس کی تعریف کی۔

”تم ملتے ہو تو پتہ نہیں اتنی سادی سمجھ بوجھ کہاں سے آجاتی ہے۔“

”یہاں پھر میری ہی بڑائی ہوئی۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کب اس کو تسلیم نہیں کیا۔“ اور وہ اس طرح تن کو مسکراتی جیسے

میری بڑائی پر فخر کر رہی ہو۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت بھائی۔

اس نے گھڑی دیکھ کر بڑی لجاجت سے کہا۔

”میرا ایک کام کہ دو گئے؟“

میں نے بہت ہی ادب سے بھک کر کہا۔ ”میں ہر حکم بجا لاؤں گا۔“

اس کے پہرے پر میں نے خوشی کی ناجائز ہوتی آن گنت کرنیں دیکھیں۔

”اس قدر خوش کیوں ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”تم پر حکم چلانے میں مزہ مل رہا ہے۔“ اس نے فوری جواب دیا۔

”حکم تو تم بیبیوں پر چلاتی ہو گی؟“

”ٹھیک ہے لیکن یہ لطف کبھی نہیں آیا۔ یہ سکون کبھی نہیں ملا۔“

”اچھا جی۔“ تو جلو تمھیں خوش کیے دیتے ہیں۔“

لیکن وہ چوکی نہیں، کہنے لگی۔ "اس خوش کرنے میں کہیں تمہاری اپنی خوشی بھی تو پوشیدہ نہیں ہے؟"

مجھے اس کو بھلانا کچھ اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی میں نے کہا۔ "تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تو کیا مضائقہ ہے؟"

اس نے اتنی روپیے میرے ہاتھ میں رکھ کر کہا۔ "یہ بھائی کو پہنچا دو۔ وہ ماؤنٹی پر میرا منتظر ہو گا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں خود آؤں گی۔" ارادہ تھا کہ میں اس کے دوران ہی میں پنچنگ کی کار میں ماؤنٹی تک ہو آؤں گی، لیکن پنچنگ ابھی آیا نہیں ہے۔ بھائی منتظر ہو گا۔ اس کو شام تک یونیورسٹی پہنچنا بھی ہے۔"

میں نے روپیے لے کر اس سے جانے کی اجازت چاہی تو اس نے کہا۔ "برا مذاق تو ایک بات کہوں۔ میں کے ختم ہونے تک میں پنچنگ کا یہیں انتظار کروں گی لیکن اب مجھے اس کے آنے کی امید کم ہے۔ یا اس ہو کہ کہیں پینے کے لیے بیٹھ گیا ہو گا۔ اس ختم ہوتے ہی میں ماؤنٹی پر تم سے ملوں گی۔"

"اور اگر پنچنگ آجائے تو میں رات بھر ماؤنٹی کے گیٹ پر کھڑا ہوتا ہوا انتظار کروں؟"

"بالکل نہیں۔۔۔ وہ اگر آجائے تو بھی میں یہیں خود اس کا حفظ کہنے کے لیے وہاں آؤں گی۔"

میں سمجھ سے کچھ نہ سمجھ سکا۔۔۔ میں سر ہلا کر دباں سے چلا آیا۔

ماؤنٹی پر تاجی کو بھائی اس کا منتظر تھا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور میں بکڑ کر چلا گیا۔ وہ جا چکا تو میں تاجی کے انتظار میں ماؤنٹی پر کھڑا رہا۔ لیکن تاجی میرے دل و دماغ میں کہیں نہیں تھی۔ دل میں اس کی جگہ پھر ابھی بھائیں بھائیں

کرنے سناؤں نے لے لی تھی جھپٹیں میں گھر سے لے کر چلا تھا۔ ان سناؤں میں مالک مکان اور تاجی ولد برج جی ہرنیوں کی طرح نالچ رہے تھے۔ میں نے اپنی انگلیاں جیب میں ڈال کر جو کچھ بچ رہا تھا اٹھا لیا۔ — ۸۸ — نئے پیسے کل کائنات تھی۔ تاجی چاہتا تھا اب تاجی نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ میں کہاں کہاں اس کی نہیں نہیں کر دلا دسی کر مسکوں گا۔ بعض وقت کتنی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں زندگی کے کتنے بڑے امتحان لیتی ہیں۔ میں تاجی سے صرف اسی لیے بھاگ رہا تھا کہ نہیں اس وقت میرے بس کار و گن نہیں تھی۔

میں نے سوچا کیوں نہ سامنے سے آتی ہوئی میں پر سوار ہو جاؤں۔

تاجی جیسے نہ پا کر چلی جائے گی۔

بس رکی تو میں اسی کشمکش کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔ دو آدمی ایک کو اس میں سوار ہو گئے۔ کھڑکڑنے سے نیس فل ہو جانے کا اظہار اشارے سے کیا اور بس بڑھ گئی۔ میں ذرا پیچھے ہٹا تو کسی سے ٹکرایا۔ دیکھا تو تاجی کھڑکی سے اڑ رہی تھی۔

اس نے کہا۔ ”صرف ایک بات مان لو“

میں اٹکار نہ کر سکا۔

وہ کہنے لگی۔ ”تم یہیں“ ”نان کن“ میں بیٹھ کر پتے رہو۔ مجھے صرف دو گھنٹے کے لیے ضروری کام ہے۔ میں تم سے یہیں ملوں گی۔“ اور اس نے میری جیب میں دس روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

پنیا میری کمزوری تھی۔ لیکن تاجی کے حوصلے اس قدر کیسے بڑھ گئے

آخر اس کا مجھ پر کیا حق ہے جو اس نے اس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

لیکن میرے لب سل گئے تھے۔ میں اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں نے اس کے بھائی کو اس کا امانت پہنچا دی ہے۔ نہ ہی اس نے مجھ سے پوچھنا ضروری سمجھا۔ وہ تیزتر قدم اٹھاتی ہوئی پھر دس کو دس کی سمت چلی گئی۔ میں نے "نان کن" کے قریب پہنچ کر دیکھا وہ دور کھڑی ہوئی کسی ٹیکسی میں سوار ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ پنکج نہیں آیا تھا۔ اس کا تو اپنا ذاتی موٹر ہے۔ پھر تاجی کس کے ساتھ گئی ہے؟

"نانکن" میں پنکج کو میں نے وہی کا آرڈر دیا تو تاجی کے قدموں کی چاہ میرے دل میں صاف نشانی دے رہی تھی۔

میں پتیارہا اور تاجی میرے ذہن سے پھر محو ہو گئی۔ گھر بار بویا بچے کچھ اس طرح میرے دل میں آکر بس گئے کہ اب تو وہاں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میرا حال اب اس بھری ہوئی بس کا سا تھا۔ جس میں خود میرے لیے بھی جگہ نہ تھی۔ میں نے سوچا اب مجھے چل دینا چاہیئے۔ تاجی مجھے یہاں نہ پا کر وہاں لوٹ جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے مزید پس و پیش نہیں کیا۔ بل ادا کیا اور نانکن سے باہر نکل آیا۔

تیزتر قدم اٹھاتا میں ابھی بس اسٹینڈ تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک ٹیکسی تیزی سے آکر بالکل میرے پاس رکی۔ دروازہ کھلا تو تاجی مسکراتی ہوئی برآمد ہوئی۔ وہ اکیللی تھی۔

"کہاں بھاگ رہے تھے تم؟"

میرا دل جیسے دھڑک کر ٹھہر گیا۔ لیکن میں نے بات کو طول دینا نہ چاہا۔
 ”اب مجھے جانے دو تا جی — میں اب اور نہیں رُک سکیں گا۔“

اس نے رکنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے سہلایا۔

”میں سب کچھ جان گئی۔ مجھے سب کچھ بتلادیا گیا ہے۔ میں نے اتنا دلت تھا کہ مالک مکان کے ساتھ ہی گواہ ہے۔“

اور اس نے چپکے سے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھا دیا۔ میں نے اپنا بند ہاتھ کھول کر دیکھا — سو روپے کا نوٹ تھا۔ وہ لوٹ کو تیزی سے ٹیکسی میں سوار ہونے لگی تو میں نے پاک کر اس کو روکنا چاہا — ”تا جی! — تا جی! یہ نہیں ہو گا تا جی! تم نے یہ پیسے اسی میرے ہاؤس ادھر سے —“

”نہیں اس سے کیا — جو نہ ہونا تھا ہو چکا ہے۔ اور — اور پھر —“
 اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا — ”تھا؟ مجھ سے رشتہ ہی کیا ہے؟“

وہ موٹر میں سوار ہو چکی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ اس کے قدموں میں پھینک دینا چاہا۔ لیکن وہ موٹر کے بند دروازے کا شیشہ چڑھا چکی تھی۔ موٹر بڑھنے لگا تو میں نے شیشے میں سے دیکھا۔ تا جی نے اپنی ساری کاپی اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

میں بیچ سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ واقعی تا جی کا میرا رشتہ ہی کیا۔ بس اسی قدر ناکہ میں ہمیشہ اس سے مل کر اداس ہو جاتا ہوں۔

مرنے والے

سڑک نے جیسے اس کے قدم پکڑ لیے — مجھے پہچانو دور نہ آگے جانے
نہ دوں گی۔!

وہ ٹھٹھک نہ گیا — سمجھ کسی سوئی ہوئی یاد نے انگڑائی لے کر چٹکی لی۔
یہ تو وہی سڑک ہے جس پر میرا بھوٹا دادا اتارا انگڑے سے سیلی جو ارگڑھوں
پر لا کر لے آیا تھا کیونکہ ان دنوں ہمارے گاؤں میں قحط پڑ گیا تھا۔ میں بھی چھوٹے
دادا کے ساتھ تھا۔ اس کی مردکی تھی۔ اپنے سر پر ایک ننھی سی پوٹلی میں نے بھی
اٹھا رکھی تھی۔

جتنے رانے اس سے کہا — تمہیں معلوم ہے اسی سڑک سے ناگپور کے
مزدور اپنے ساتھ کئی سو گدھوں کا قافلہ لیے زمین کو ہوار کرنے کے لیے یہاں آئے

تھے۔ زمین کھودی جاتی تھی تو مٹی کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے وہ اپنے گدھوں سے کام لیتے تھے اور واقعی اس سنگلاخ زمین پر فیکٹری کی بنیاد رکھنے میں ان مزدوروں کا بڑا حصہ ہے۔

وہ کوئی چالیس سال بعد اپنے گاؤں کو لوٹا تھا۔
ماضی تو کسی مرحوم دوست کی مانند ہے کہ اس کی قبر پر پہنچو تو اپنی یادوں کو سمیٹ کر جیسے جاگ اٹھتا ہے۔

جب وہ شہر سے چلا تھا تو کتنے ہی چہرے اس کے ذہن میں بیٹنی بن کر بیدار ہوئے تھے۔ پھر ان کے خدو خال آہستہ آہستہ واضح ہوئے پھر وہ جیسے آنکھوں کے سامنے نجم ہو گئے۔

چھٹی نینلو، بڑے حضرت دادا، کانے اور سیسے کی گولیوں والا بچہ، گلی ڈنڈے والا رحمان۔ ریڈی، بوٹ والا پاپیا، جس سے اس کی تھیوتی تھی، جوان اور خوبصورت لیکن بیوہ ماں اور پھر پھیلیوں سے بھرا گھنے سایوں سے ڈھکا چھوٹا سا تالاب، زندہ سیر کی اونچی سی قبر۔

تم تو ابھی سے اپنے گاؤں والوں میں کھو گئے ہو۔
جتنی را کہہ رہا تھا — یہی جذباتی لگاؤ جو تمہیں گاؤں والوں سے اور گاؤں والوں کو تم سے ہے یقیناً ہماری بات کو موثر بنا سکتا ہے۔
اور وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ اپنے گاؤں کے بایسوں کو آزادی کی رہنمائی اور برکتیں بتلانے چلا تھا۔

”من مول“ گا سا گاؤں رام چندرا پورم کے ہیوی الیکٹرک پلانٹ

کے زیر اثر آ رہا تھا۔ جو تیسرے منصوبے کے دوران میں چیکو سلواکیہ کے اشتراک سے تیار کیا جا رہا تھا۔ ایک لاکھ ساڑھے بہتر ہزار مربع میٹر کے رقبے پر اس کا رخنہ کی پوری عمارت مشتمل ہوگی اور فیکٹری کا پورا رقبہ ساڑھے گیارہ لاکھ مربع میٹر سے کچھ زیادہ یعنی تقریباً تین سو اٹھارہ ایکڑ ہوگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے ایک ایک فرد کے پھرے پر جگہ گانے مستقبل کی کرنیں ناچتی دیکھے گا۔ انھیں بتلائے گا کہ ہمارا گاؤں، ہماری قومی خوشحالی کے بڑھانے کے لیے اپنے ہم وطنوں کے کام آ رہا ہے۔ آندھرا پردیش کی صنعتی ترقی میں یہ پراجیکٹ قطعی اہمیت کا حامل رہے گا اتنی ہی اہمیت "من مول" کے کے ان ذالیوں کی رہے گی جنہوں نے اپنا گاؤں قوم اور وطن کے لیے خوش خوشی دے دیا ہے۔ پراجیکٹ کی ابتدائی پلاننگ کے نقشوں میں "من مول" کا نام دیکھ کر آنے والی نسلیں سوچیں گی کہ یہ چھوٹے چھوٹے گھر جن کے صاف ستھرے انگنوں میں نیم کے درخت ہوں گے، جن کی چھتوں پر پیل کے سائے ہوں گے، جن کے دھوئی گھر دس سے سو روپے کی پہلی کون سے پہلے ہی دھواں اٹھنے لگا ہوگا جن کے ڈھور ڈنگر شام کو ہی لوٹ آتے ہوں گے جہاں گائیں کھوٹی سے بندھی اپنے بچھڑوں کو چاٹتی ہوں گی۔ جہاں نوجوان دادھائیں دیب جلا کر کھیتوں سے لوٹتے ہوئے اپنے متوالوں کی منتظر رہتی ہوں گی۔ جہاں بوڑھی مائیں دعائیں دیتی ہوں گی اور شہریر بچے ادھم مچاتے ہوں گے وہ "من مول" اب کیوں نہیں ہے۔ اس کے پاس جہاں بھی انھیں رہنے کے لیے زمین مل سکی ہے منتشر ہو گئے ہیں اور یہ سب کچھ انھوں نے قومی خوش حالی کے لیے کیا ہے۔ یہ بلیدان

انہوں نے اپنے وطن کے لیے کیا ہے۔

اپنی تقریر کے لیے ذہن میں مواد جمع کرنا جب وہ سڑک پر پہنچا تو سڑک نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ — مجھے پہچانو ورنہ آگے جانے نہ دوں گی۔

اور جب اس نے سڑک کو پہچان لیا تو اس نے اپنے ساتھی جتنو را سے

کہا کہ "من مولیٰ" میں ایک بار غلط پڑا تھا تو میں اور میرا چھوٹا دادا ایک دوسرے قریب سے پیلی جو اگر گھوڑوں پر لا کر لے آئے تھے تاکہ گاؤں بھر کی پریشانی مٹا دی طو پر سہی کوئی دوسرا انتظام ہونے تک دور ہو سکے۔ وہ سماں مجھے یاد ہے۔

رامو بولا ہے نے ہمیں گدھوں پر جوار لاتے ہوئے سبکے پہلے دیکھ لیا تو وہ کھٹکے گاؤں میں بھاگا اور لوگوں میں یہ خبر جیسے سوکھی گھاس میں لگی آگ بن گئی۔ بچے

بالے دوڑ پڑے جو نقامت سے نہ چل سکتے تھے وہ بھی اپنے بڑوں کی گود میں

سوار جوں توں سڑک تک چلے آئے۔ بوڑھیاں گھروں سے باہر نکل آئیں جو ان

عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں کہ چھوٹے حضرت کے جلو میں آگے بڑھتے ہوئے

اس کاروان زندگی کو دیکھیں۔ چنا پتلو غلہ لاءا ہے۔ دیکھو۔ وہ دیکھو۔

ہمارا گھرانہ پٹلا اور چنا پتلو کے نام سے مشہور تھا۔ لوگ اسے چھوٹے

حضرت اور بڑے حضرت کا گھرانہ بھی کہتے تھے۔ ہم گاؤں میں پہنچ گئے

تو زندہ سید کی قبر کے نیچے پیل کی تنگی شاخوں کے اچلے سالیوں میں پیلی جوار

اس طرح تقسیم ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ کی طرح زندہ سید کے اونچے سے مزار پر

چڑھ کر بیٹھ گیا اور اطمینان سے گھوڑے کی سوا دی کرنے لگا۔ کتنے ہی بڑے

بوڑھے جو مجھے ایسا کرنے پر پھیکا کرتے تھے اس سے چپ ہو رہے، جوار لانے میں

میں بھی چھوٹے دادا کے ساتھ جوتھا۔ میں نے اپنی اس برتری کو محسوس ہی کیا تھا کہ امام حجی نے لکھارا — ”اتو مرد کیا اکیلی اور محظ پھیلائے گا“ — میں زندہ سید کی قبر سے کود پڑا۔ لیکن میرا جی جا ہا۔ امام چاچی کو پیل کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھا دوں اور دیکھوں کہ کس طرح اتو فی ہیں۔ یہ میری اپنی دانست میں سب سے کڑی سزا تھی۔“

وہ کہتا گیا — مجھے یاد ہے۔ کھیل کھیل میں درخت کی کسی اونچی سی شاخ پر جب میں چڑھ جاتا تو مجھے یہ خیال بھی نہ ہوتا کہ اتنے بڑے وقت مجھ پر کیا جتنے والی ہے اور جب اتنا چاہتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب پیہ پھیلا اب ہاتھ چھوٹے، اب شاخ ٹوٹی اور میں زمین پر آ رہوں گا۔ خوف کی بنیادیں اس احساس کے ساتھ ہی اندر ہی اندر گہری ہوتی چلی جاتیں اور میری بے بسی کا عالم دیدنی ہوتا۔ اشرمیاں بے طرح یاد آتے اور میں دل ہی دل میں تو بہ کرتا کہ کبھی اس قدر اس قدر بلندی پر نہیں چڑھوں گا۔ سودا خاں کے باغ سے نہ امراد چراؤں گا۔ نہ نازنگیاں۔ ماں نماز پڑھنا چاہے گی تو وضو کے لیے کنویں سے پانی خود نکال کر دوں گا اور اسے ستاؤں گا نہیں — زندہ سید کی قبر پر کبھی نہیں چڑھوں گا اور قبلہ رو کھڑے ہو کر کبھی موتوں کا نہیں۔ شاخوں سے چھٹا ذرا سائیچے آنے میں کامیاب ہوتا تو پھر حوصلے بڑھتے اور جب زمین پر پیرٹک جاتے تو میں خود کو زمانے بھر کا فاتح محسوس کرتا۔ اس شاخ کو دیکھتا جن پر میں پہنچ گیا تھا تو وہ پہلے تو پہچانی نہ جاتی پھر ایسی اونچی نہ دکھائی دیتی اور اشرمیاں کی تو اب ضرورت ہی نہ رہتی اور وہ یاد بھی نہ آتے۔

جتندرانے اس کو مخاطب کیا۔ گاؤں کے کسی آدمی کو ساتھ لے لو تاکہ وہ ہمیں لوگوں سے ملا سکے۔

اس نے جتندر کو روک دیا۔ میرے ذہن میں ایک چالیں سالی پڑا نا شخص بیدار ہو گیا ہے۔ ہم ذرا اسی کی یاد کے سہارے گاؤں بھر کا پتہ لگاتے ہیں ذرا دیکھیں یہ دس سال کا لڑکا ہمیں کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔

دیکھو۔۔۔ اس نے ٹھٹھک کر کہتے ہوئے کہا۔۔۔ جتندر یہ ہے زندہ سید کا نواسہ جس میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ سا گئے ہیں۔ یعنی مرے نہیں ہیں۔ قبر میں زندہ اتر گئے ہیں تاکہ گاؤں والوں کے اعمال کا احتساب کریں اور وقتاً فوقتاً مصیبتوں سے نجات دلائیں۔ یہ اطراف جوتنی بہت ساری قبریں ہیں وہ اس وقت نہیں نکلیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بہت تاخیر سے پہنچا ہوں۔ پتہ نہیں کتنے ساتھی زندگی سے محو موڑ چکے ہیں۔ کھنٹے بزرگ ان سے آگے نکل گئے۔

آؤ اب باتیں جانب گھوم کر سیدھے اس مسجد کے میناروں کی سمت چلتے ہیں میرا گھر وہیں کہیں تھا۔ سنا ہے اب ملیہ کھلی باقی نہیں رہا ہے جس کا لانا تھا اس نے اس سے استفادہ کیا۔ کچھ نشانیاں تو وہ گھمیں ہوں گی۔ نیم کا درخت جس کی شاخ جھکا کر بڑا دادا میرا اس کے لیے ڈنٹھل توڑ لیا کرتا تھا یقیناً زندہ ہو گا۔ وہ کنواں تو ہو گا ہی جس کی گہرائی میں ڈول پھینک کر میری ماں ٹھنڈا میٹھا پانی اس تیزی سے نکال لیتی تھی۔ جیسے مرحوم ابا کی یادوں کی گھڑی اس کنوئیں میں گھر پڑی تھی اور وہ جلد از جلد اس کنوئیں کو خالی کر دینا چاہتی تھی تاکہ اس گھڑی کو نکال سکے۔ لیکن جھوٹا دادا میری ماں کے ہاتھ تھام کر بانی

سیدھنے میں اس کی مدد کرتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کنوئیں میں پایا
 اس کو بال ب بھر دینا چاہتا ہوتا کہ میری ماں مرحوم ابا کی یادوں کی
 ہی نہ سکے۔ میں ان باتوں کو سمجھنے لگا تھا۔ میں عمر کی اس منزل
 جہاں اپنی ماں کو اپنے چھوٹے دادا سے بات کرتا ہوا دیکھ کر میں سمجھ
 کوئی بیوہ ماں اپنے مرحوم شوہر کے ہم عمر چچا سے بات نہیں کر رہی ہے
 عورت ایک مرد سے بات کر رہی ہے۔ ایک نظر ایک نظر سے بار
 ہے اور ایسے میں میرے مرحوم ابا کی یادوں کی گھڑی۔ کسی کینہ بیس کو
 گہرائی ہی میں بھلی گئی تھی۔

چھوٹا دادا مصلحتاً میرا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ ماں تو
 تھی۔ اس کی محبتوں پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا۔ یہ احساس مجھے
 ماں کبھی کبھی مجھ سے ڈرتی تھی۔

اود۔۔۔ یہی میرا گھر ہو گا۔ ذرا رگ جاؤ۔ بالکل یہی
 بے درو دیوار کے اس گھر کو میں پہچان گیا ہوں۔ وہ دیکھو نیم کھڑا
 وہ اتنا بلند قامت ہو گیا ہے کہ کوئی بھی ہاتھ بڑھا کر اس کی شاخ
 مسکتا۔ کنواں وہیں کہیں ہو گا جو جنگلی خود رو جھاڑیوں میں چھ
 یہ گھر تو جوں کا توں میری نگاہوں کے سامنے کھڑا ہے۔ بالکل اسی
 طرح میں نے اس کو چھوڑا تھا۔ جیسے درو دیوار سانس لے رہے
 وہ دیکھو میری ماں دیا جلا کو طاق میں رکھ رہی ہے۔ وہ دیکھو
 دادا کے کہنے پر میں شیر کا ناچ ناچ رہا ہوں اور میری ماں دو ہر

بہنس رہی ہے۔

یہ مکان تو بایا کا ہے۔ بایا جو لاہا۔ میرا گھٹی ڈنڈے کا سٹھی
 — ادر — تم — تم تو بالکل — جی — جی میں بایا کا بیٹا ہوں —
 اچھا — پھر کہاں ہے وہ — وہ کہاں ہے — مر گیا؟ —
 ہوں — آؤ تمہیں سے گلے مل لیں۔

جتنے رانے زبان تک نہیں کھولی — اس نے اجنبی کو اپنے ساتھی کا
 نام تک نہیں بتایا۔ وہ ان اشاروں، کنایوں کی، آنکھوں کی زبان ہی سمجھتا
 رہ گیا — ہر بات میں اختصار بھی، تفصیل بھی۔
 ”تو پھر پھوڑ رہے ہو گاؤں؟“

”ہاں“

”یہت اچھے، بہت اچھے — کہاں جا رہے ہو؟“
 ”ابھی کچھ طے نہیں ہے۔“

”عام طور سے لوگ کس طرح سوچ رہے ہیں؟“
 ”کچھ خوش نہیں ہیں — اپنی زمین چھوٹ رہی ہے۔ گھر بار بھڑٹ
 رہا ہے۔“

وہ کہنے لگا — ”ہمیں اپنے مستقبل کے لیے کچھ تو تجنا ہی ہو گا۔ میں یہی
 باتیں تو تم لوگوں سے کرنے آیا ہوں۔“

”چلو آگے چلتے ہیں۔“ اس نے جتنے راکی بانہہ بکڑ کر کہا۔
 ”آؤ اس پیل کے سائے میں پہنچ کر اس کی ٹھنڈک کو تحس کریں۔ یہ پیل

بڑا پرانا ہے۔ کتنی ہی کہانیاں اس کے گھنے سایوں میں بنی ہیں۔ ہم تلنگی پر
 کے لیے جب اس مندر کی طرف جاتے تو اس ٹھنڈے گھنے سائے میں ذرا کی
 ذرا رک کر دم لینا ضروری تھا۔ سیسے اور کانسی کی گولیاں صرف لمحہ بھر کے
 لیے جیبوں سے نکال لی جاتیں۔ پھر یہ لمحہ پھیلنا جاتا تھا۔ کئی کئی منٹ گزر جاتے
 تھے۔ شاید کسی ہم جماعت نے سچے پستلو کو مندر کے چبوترے پر لے جا کر بتلا
 دیا کہ ہم کھیل رہے ہیں اور پستلو وہیں سے پکارتا۔

”بیٹھ کھجا رہی ہے کہ سر کھجا رہا ہے؟“

اور ہم اپنی گولیاں بٹور کر جیبوں میں محفوظ کر لیتے اور بکسٹ ڈر کر آگے
 پہنچ جاتے۔ درخت کے سائے سے مندر کے سایوں میں پہنچنے تک یہ بات
 قطعی ہو گئی ہوتی کہ سبق ختم ہونے پر اس لڑکے کی درگت بنائی جائے گی جس
 نے ہمیں کھیلنے ہوئے پکڑا دیا ہے۔

ایک بار لگان ادا نہ کرنے کے جرم میں ٹیل پٹواریوں نے بہت سارے
 کمالوں کو پکڑ لیا تھا اور یہاں چانڈی پر لے آئے تھے، بھلستی ہوئی گولیاں
 تھیں، لودیتا ہوا دن — نظام سرکار کا زمانہ تھا لیکن ظل اللہ کا کوئی سا
 کسی کسان کے سر پر نہ تھا بجائے اس کے پتے ہوئے بڑے بڑے پتھر ان کے
 سروں پر دیے گئے تھے۔ ہم دو تین ساتھی یہ ساری کارروائی اسی پیل کی
 گھنی شاخوں میں چھپ کر دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد موٹی موٹی سنی ہوئی
 موچھوں والے ٹیل سے ہمیں نفرت سی ہو گئی تھی اور ہم دل ہی دل میں اس
 سے ڈرنے لگے تھے۔

آؤ داہنے اور گھوم کر اس گلی سے چلیں تو شاید ہم مسجد کے بچھو اڑے نکلتے
ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہر چیز جوں کی توں ہے۔ گھاؤں والے بدل گئے ہیں
میں بدل گیا ہوں، لیکن گھاؤں بالکل نہیں بدلا۔ پیل کے سائے سے جو مندر
متقیں نظر آ رہی تھیں اس کا دروازہ یہ رہا۔ اور پھر اسی میدان کا چکر کاٹ کر بائیں
جانب مڑ جاؤ تو مسجد میں داخل ہو سکتے ہو۔ مندر میں ہم "سر سوتی اوم نامھ"
پڑھتے اور مسجد میں گلستانِ بوستان۔ چنچا نیلہ تنگو پڑھاتا تھا۔ اور میرے
بڑے دادا گلستانِ بوستان۔ گھاؤں کا کوئی پتہ ایسا نہیں ہے جو ان دونوں
کا شاگرد نہ ہو اور جس کی ان دونوں کے ہاتھوں پٹائی نہیں ہوئی ہو۔
وہ ادب کی لال بھت دیکھ رہے ہو۔ وہ یقیناً رحمن ریڈی کا بنگلہ ہوگا۔
یہ بنگلہ ان دونوں نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو ایسا نہ تھا جو آج دکھائی دے گا ()
ہے۔ رحمن ریڈی میرا گلی ڈنڈے کا ساتھی ہے۔ سنا ہے میرے ساتھیوں میں
صرف وہی ایک زندہ ہے۔ چھ بھوکا، لچو دھوئی اور بابا بولا یہ سب کے
سب چل بیٹے ہیں۔ ان کی آل اور لاد یقیناً ہو گئی جو مجھے جانتی نہیں۔
وہ گھاؤں بھر میں گھومتا رہا۔ ایک ایک چیز کو دیکھتا۔ یادوں کو سمیٹتا۔
ایک ایک چہرے کو تکتا۔ مسجد کے پیچھے سخونی بی کا مکان تھا جو پیش امام
کی بیوی تھیں، پیش امام کو مرے زمانہ ہو گیا تھا۔ بڑھیا بھی اب کہاں باقی
ہوگی۔ اس کے قدم پھر بھی دروازہ کی طرف اٹھ گئے اور اس نے کندھی کھٹکھا
دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے زور سے پھر کھٹکھٹایا۔
"کون ہے رے"۔ آؤ از بڑھی تھی۔

”میں ہوں ماں“

”میں کون؟“ — بوڑھی نے دروازہ کھولا تو وہ مسکراتا ہوا آگے

بڑھا۔

”اچھا تو ہے — تو بڑے حضرت کا پوتا ہے نا۔ تجھے بڑا انتظار تھا،

تیرا —“

”ہاں ماں میں آگیا ہوں“

”کیوں آیا ہے — ابھی کچھ دن اور نہ آتا — اور پھر کیا لے آیا ہے

سے ہمارے لیے۔ یہی خوش خبری نا کہ گاؤں چھوڑ دو — اس لیے چھوڑ

دو کہ تیرا ملک ترقی کر رہا ہے — ہم اپنا گھر بار چھوڑ دیں۔ کھیت کھلیاں

چھوڑ دیں۔ مسجد کے کونوئیں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی چھوڑ دیں جو ہر ایک کی رگوں

میں خون بن گیا ہے۔ یہاں کے سارے چھوڑ دیں، یہاں کی دھوپ چھوڑ دیں

اس مندر کو چھوڑ دیں جہاں تو نے ادنا نہ پڑھا تھا۔ اس مسجد کو چھوڑ دیں

جہاں تجھے تیرے دادا نے کھتاں بوستاں پڑھائی اور تب کہیں جا کر تو نے

شہر میں بڑی بڑی ڈگریاں لیں — تو تو بھول بیٹھا ہے — تجھے تو یہ بھی

یاد نہ ہو گا کہ جب تو چھوٹا سا تھا تو ہمیشہ میں اللہ کو پیارا ہو گیا ہوتا اگر میرا

بولوی تجھے پناہ بجاتا۔ کیا بے گل تھا وہ۔ رات بھر ایک نہ تھپکی اس کی۔

دن بھر زمین سے پیٹھ نہ لگی۔ منٹ منٹ پر دم کر کے تجھے پانی پلاتا۔ تب کہیں

تو نے آنکھیں کھولیں — جب کچھ ہاتھ پاؤں نکالے تو شہر کا نور پا۔ پلیٹ

کر کھیر کھیر تک نہ لی۔ ادا آج چالیس سال بعد تو گاؤں والوں کو سبق

پڑھانے آیا ہے کہ خوشی خوشی گاؤں چھوڑ دو — مجھ سے یہ کہنے آیا ہے کہ میری ہڈیاں اب میرے مولوی کے برابر دفن بھی نہ ہوں گی — اے میں نے تو اپنی قبر تک کھودالی ہے — اپنے نام کا کتبہ تک لگوایا ہے۔ صرف میری موت کی تاریخ کھودنی رہ گئی ہے۔ سو یہ کام تو کر دینا۔ بہت دور سے چل کر آیا ہے تو؟

وہ کہتی گئی — میں نے اپنے ایک ایک بچے سے کہہ دیا ہے کہ گاؤں خالی نہیں ہو گا۔ سرکار بنوالے اپنی فیکٹری سہادی لاشوں پر۔ جب تک سہادی آنکھوں میں بیٹائی ہے میرے گاؤں کا کوئی بچہ من مول کی ایک کٹیا کو بھی زمین پر آتے ہوئے نہیں دیکھے گا۔ گھر تو گھر ہیں — تجھے پتہ ہے جب کبھی کوئی گھر ڈھے جاتا ہے تو آدمی اس کا لبہ عمر بکھرا اپنے سینے میں اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے لیکن گھر نہیں بنتا۔

”سنی ہوں تیری سرکار معاوضہ دے گی — بھلا بتاتا تو ان ہراؤں کا معاوضہ کیا ہو گا جو حقوں سے جسم میں اتر کر روح بن گئی ہیں — تو نے گاؤں کی ہر میت بھلا دی ہے۔“

”تجھے تو اب تک یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ چالیس سال کے بعد تو نے اپنے گاؤں کی دھرتی پر قدم رکھا ہے۔ لیکن تیرا کوئی ساتھی، تیرا کوئی یار، تیرا کوئی دوست تیرے سوا گت کو گاؤں کی سرحد تک بھی نہ آیا — ویسے تیرے آنے کی خبر سب کو ہے۔ یہ کوئی اچھی علامت ہے، اے اور تو دیوانوں کی طرح گاؤں میں اکیلا اکیلا پھرتا ہے۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے۔ تیرے آنے کی میرے

بچوں کے دلوں میں خوشی بھی نہیں۔ آخر کیوں۔ بچھڑا ہوا بھائی اپنے گھر آیا ہے تو کوئی بڑھ کو گلے لگانے والا نہیں ہے۔ ”یہ من مول“ یہ گاؤں یہ تو ایک خاندان ہے۔ یہ تو ایک گھرانا ہے اور تو بھی اسی خاندان، اسی گھرانے کا بیٹا ہے۔“

”اور تم اس گھرانے کی ماں ہو۔ اس خاندان کی ماں ہو۔ سارے من مول کی ماں ہو۔ ہونا؟“

”ہاں ہوں۔ بالکل ہوں۔“

”کیوں نہیں ہوں۔ کیوں نہیں ہوں۔ مگر تو“

”مگر تم نے میری بات سنی ہی کہاں“

”میں تو اپنی ماں کے لیے اس کی ماں کا پیام لایا تھا۔ میں تو اپنے ”من مول“ کے لیے ہندوستان بھر کی دھرتی کا سلام لایا تھا۔“

”میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ کوئی سرکار ہم سے ہمارا ”من مول“ لے نہیں رہی

ہے۔ ماں۔ لیکن ہم خود اپنے وطن کو اپنا ”من مول“ دے رہے ہیں، ہم اپنے مستقبل کو اپنا حال دے رہے ہیں۔ اپنے کل کو اپنا آج دے رہے ہیں۔

تم مان جاؤ ماں۔ تم مان جاؤ گی تو سارا گاؤں مان جائے گا۔ آنے والی سلیس ہمیں یاد رکھیں گی ماں۔ جب الیکٹرکس پلانٹ مکمل ہو جائے گا ماں تو خوش

حالی بڑھے گی۔ تیرے ہی بچے بالے سکھ اور آئندہ کی زندگی گوارہیں گے۔ کتنے ہی لوگوں کو کام مل رہا ہے تو ذرا سوچ تو ماں غور سے نے ابھی بتایا تھا کہ وہ اور

اس کے دونوں بھائی پلانٹ ایریا کے اطراف بنتے ہوئے بارکوں اور عمارتوں

میں مستری کا کام کر رہے ہیں۔ اور انھیں یومیہ ساڑھے تین روپے مل رہے ہیں۔ اس طرح تیرے گھر یومیہ ساڑھے دس روپے آجاتے ہیں اور تو پھر کبھی خوش نہیں ہے۔“

”بہت خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔ یہ چار دن کے ساڑھے دس روپیوں نے تجھے خبر ہے مجھ سے کیا کیا پھین لیا ہے۔ ان روپیوں نے کھلیاؤں کا سونا پھین لیا۔ ان روپیوں نے تجھے خبر ہے وہ کدھ پھین کی جس سے ننھی ننھی کو نپلیں پھوٹی تھیں۔ ان روپیوں نے میرے بچوں کا وہ پسینہ پھین لیا جن کی کھار پی کو سوندھی جوار کے خوشے اہلہاتے تھے۔ ان روپیوں نے سیلوں کی گھٹیوں کی وہ میٹھی آوازیں پھین لی ہیں جنھیں سن کر تو بیدار ہوتا تھا اور آج ان آوازوں کے سریشیوں کی گڑ گڑاہٹ کے نیچے دب گئے ہیں۔ اور ایسے میں تو مجھے عقل سکھانے آیا ہے موٹی موٹی کتاب میں پڑھ کر مجھے بتانے آیا ہے کہ بال دھوپ میں پکتے ہیں۔ میں کہوں۔ میں کہوں۔ کوئی کتاب۔ کسی سفید بال سے زیادہ نہیں ہوتی۔“

اس نے یہ غور جتندر کو دیکھا۔ پھر کچھ اس طرح کہنے لگا۔ جیسے خود اپنی کھوئی ہوئی آواز کو ڈھونڈ رہا ہو۔

”ماں کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے۔ کل تو جب سرکار نے مجھے جیل میں بند کیا تھا اور تو نے فرسے کہا تھا کہ اپنے وطن کی بھلائی کے لیے لڑنے والا دینا تو ہمارے گاؤں کا بنیا ہے۔ کل تو جب اپنے بیٹے کو جیل میں دیکھ کر فرسے کہہ سکتی تھی ماں تو آج اپنا گھر اپنے دیس کے لیے چھوڑتے ہوئے بھی کہتے

تجھے نہیں ہٹنا چاہیے۔

یہ گاؤں تجھے بھی اتنا ہی پیارا ہے ماں! — تجھے بھی یہاں کی ایک ایک چیز سے محبت ہے۔ ایک ایک چہرہ میری یادوں میں باہوا محفوظ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تجھے اپنے من مول کی دھرتی پیاری نہیں ہے۔ میرے گھر کے کھنڈر بھی یہیں ہیں۔ میرے باپ دادا سے بھی یہیں دفن ہیں، لیکن ہم جس کے لیے یہ سب چھوڑ رہے ہیں۔ وہ دیں بھی تو ہمارا ہے۔

اپنے گھر میں اپنا کمرہ سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اپنے گاؤں میں اپنا گھر سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اپنے شہر میں اپنا گاؤں سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اپنے صوبے میں اپنا شہر سب کو پیارا ہوتا ہے۔ محبت اور پیار کا یہ تصور اسی طرح وسیع تر ہوتا جاتا ہے ماں۔ اور جب سارا دیں کسی کو پیارا ہو جاتا ہے تو ساری تفریق مٹ جاتی ہے۔ جب سارے دیں کی دھوپ چھاؤں اپنی ہو جائے تو من مول "بہت وسیع ہو جاتا ہے اس کا پیار بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کی حد یہ دیں بھر میں پھیل جاتی ہیں۔"

بڑھی ماں نے نظریں اٹھا کر دور دور تک دیکھا جیسے "من مول" کے حدود سے آگے دیں بھر کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دور ہری ہو کہ وہ اپنی چٹائی سے اٹھی۔ اس نے کہا تجھے نقارہ کے میدان تک لے چل میں خود اپنے ہاتھوں سے نقارہ پیٹ کر منادی کو دوں گی اور اپنے بچوں کو جمع کر کے کہوں گی کہ وہ اپنے دینا کو پہچانے جو سارے ملک کا سلام "من مول" کے لیے لایا ہے۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور اس کی آوازیں فضاؤں میں بلند ہو کر پراچٹ کی مشینوں

کی آوازوں سے جیسے بغل گیر ہو گئیں اور "من مول" اڑ کر رام چند را پورم کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن جب بڑھی ماں نے نقارے کی آواز پر داہنی طرف آتے ہوئے اپنے بچوں کو دیکھا تو اس کے ہاتھ مضحمل ہوتے گئے اور اس سے پہلے کہ اپنے بچوں کو وہ کچھ کہتی اس نے تھکی تھکی نظروں سے سب کو دیکھا اور زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کے بچے اس کو ہوش میں لانے کے لیے اس کی طرف دوڑ پڑے اور ان دوڑنے والوں میں دینا بھی تھا۔

راہیے ایسا

جب وہ پیٹ میں پڑی تھی تو راہی ایسا کے پیٹ میں سوائے اُس کے جیسے کچھ رہ ہی نہ سکتا تھا۔ نہ پانی کی بوند نہ سنگترہ کی بھانک کا دس نہ چیخ پھر دایم کا حیرہ۔ برف کے ٹکڑے مانوان کی غذا بن گئے تھے۔ اس طرح اپنا آبا ج کر اسے اپنے بطن سے جہنم دیا۔ اُسے اپنی بھاتیاں چو کر دودھ اس طرح پلایا کہ لہو کی بوندیں بھی ساتھ پلانی پڑیں۔

پھر جب وہ دنیا میں آئی تو کتنی راتوں کی نیند کتنے دنوں کا چین راہی اپنا تے اپنے پر حرام کر لیا۔ تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوئی کہ دو قدم چل پھر لیتی۔ ورنہ وہ کون ایسی صحت مند تھی جو راہی ایسا کی آغوش میں ایک سکھتی سی جان، کلکاریاں لگاتی ہوئی علانیہ محسوس ہوتی اور آنے جانے والے اس نئی زندگی کی طرف توجہ دیتے۔

لیکن آج جبکہ اس نے اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ آج جبکہ وہ پٹ پٹ باتیں کر سکتی تھی اُس نے ماں کو سبھوں کی طرح رانی اپنا بھی تو نہ بکا را۔

اور رانی اپنا سب کچھ سُن کر اگر کچھ سیکھ سکیں تو پانچلوں کی طرح مسکرا کر انا۔ ایسی مسکراہٹ جو اپنی بے بضاعتی اور کم مانگی کا احساس چھپانے کے لیے ہونٹوں تک لائی جاتی ہے۔ اور اگر وہ ہونٹوں سے چپک کر ہی رہ جائے تو زندگی کیسی لٹ کر رہ جاتی ہو۔ رانی اپنا سُن کا ایک ایسا خالی ڈبہ تھیں جس کو ذرا سے ہونکے پر پُٹن سے بول اٹھنا چاہیے۔ لیکن یہ خالی ڈبہ لبالب بھرے ہوئے ڈبوں کی طرح خاموش تھا۔ اب اس خالی غولی خاموشی کے سہارے تپ دق کو نس نس میں سمائے وہ زندگی کے سفر پر چل پڑیں۔

رنگ روپ آہستہ آہستہ اس طرح غائب ہوا جیسے کٹے ہوئے سُرخ سُرخ سیب کے گودے کی سفیدی ہوا کھا کر غائب ہوتی ہے اور رانی اپنا ہوا نہیں دھوپ کھا رہی تھیں۔ دھوپ بھی کیسی دھوپ جس کی چمک تو دکھائی نہ دیتی تھی مگر حرارت بدن کا حصہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس حرارت میں سب رنگ روپ گھل گیا۔ اس حرارت میں سب لطیف احساس گھل گیا۔ اور رانی اپنا ایک ایسی مسکراہٹ کو پکڑ کر رہ گئیں جس کا ناتا رشتہ آنسوؤں سے جا ملتا ہے۔ میں نے تو اس مسکراہٹ میں ہمیشہ آنسو ہی دیکھے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہروں کو سبھوں نے اس مسکراہٹ میں ہی کچھ دیکھا۔ سارے گھرنے۔ اور سب ہی نے آنکھیں پھیر لیں یہ بھی بُرا نہ تھا۔ رانی اپنا کہاں ہر ایک نظر کو ٹٹولتی پھر رہی تھیں کہ کس میں کتنا پیار ہے؟ ان کو ہر بات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جان چکی تھیں کہ

ان کے فرائض کیا ہیں۔ اپنے وجود کو گھر بھر سے اس طرح الگ کر لو کہ مختار اسائیہ کم ہی کسی پر پڑے۔ رانی تم ماں ہو، تم بیوی ہو، تم بہن ہو۔
سورانی نے خود کو بھرے گھر میں تنہا تنہا محسوس کیا۔

حادث بھائی، اپیا کی قیمتی ہوئی زندگی پر نیم کا گھنا سایہ بنے ٹھنڈے پہچانے کے لیے ڈولتے رہے۔ لیکن جلد ہی جب اس نیم کے سائے کو اس بات کا یقین سا ہو چلا کہ اپیا کا تپ دق ٹھنڈے سایوں پر بھی آگ بھینک دے گا تو ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ ساتھ سائے دیوار پر چڑھنے لگے۔ حادث بھائی اپیا کی زندگی سے کچھ اس طرح دکھلا کر نکلتے کہ اپیا کی ہمدردی میں بھوٹ موٹ کی اداکاری بھی وہ کامیابی سے نہ کر سکے۔ اور دوسری جست میں انھوں نے چو کی نشین ہو کر مصلیٰ سنبھال لیا اور لگے وظائف پڑھنے اور تسبیح پھیرنے۔

اتنے بڑے سنے گھر میں اب چار دوحیں ایک دوسرے سے بیگانہ بیگانہ سی پھرنے لگیں۔ پھر تین دوحوں نے آہستہ آہستہ سر جوڑ لیا۔ اور رانی اپیا نے آنکھیں کھول کھول کر سب کو دیکھا، سب کو سمجھا اور اب صرف وہی انکیلی رہ گئیں۔

رانی اپیا پہلے ماں تھیں، ویسے حادث بھائی کو بھی انھوں نے کب ٹوٹ کر نہ چاہا۔ لیکن حادث بھائی خود بھی تو سیرانے تھے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر انھوں نے جاننا نہ کی جیسے چادر تان لی تھی۔ پانچ منٹ نماز پڑھتے، پھر وظائف پڑھتے اور گھر میں جب تک رہتے تسبیح ہاتھ میں رہتی ادویوں اپنی دینیادی خواہشوں کو بے چاروں نے جاننا نہ کے پیچھے چھپا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اور رانی اپیا

نے بھی خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ مجھ نصیبوں حلی نے جو کچھ محبت حادث کو دی
 ہے، جو کچھ سکون اسے بخشا ہے، جو کچھ تسکین اسے پہنچائی ہے اس کی عمر اس قدر
 قلیل تھی کہ اس نے مجھ سے جدا ہو کر اپنی بھری جوانی میں جانا ڈاڑھ لی تھی۔ حارث
 بھائی کی زندگی کی اس طہارت پر رابی اپنا کبھی جی ہی جی میں خوش ہوتیں۔
 کبھی ان کا جی موس کر رہ جاتا، کبھی ایسی دل گرفتہ ہو جاتیں کہ ان کے بس میں
 ہوتا تو ٹوٹ ٹوٹ کر حادث بھائی کی تسکین کا باعث بنتیں۔ رہ گئی لاڈلی
 سودہ کچھ دن بے کل بے کل سی گئی گئی پھرتی رہی۔ جب کبھی رابی اپنا کئے قریب
 آنا چاہا انھوں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کو روک دیا۔ خدا امیری
 جان۔ خدا امیری بچی۔ مجھ سے نہ لپیٹو۔ اللہ تیرا محافظ ہے۔
 اس طرح لاڈلی کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کتنی ہی بار رابی اپنا نے ایسا محسوس
 کیا کہ جیسے وہ اپنی روح کو اپنے تن سے جدا کر رہی ہیں۔ اڈاڈ کو پلکوں تک
 آئے ہوئے آنسوؤں کو انھوں نے پلکیں بھیک بھیک کر اس لیے روکا کہ لاڈلی
 پوچھ نہ لے کہ اتنی تم رورہی ہو۔ لیکن لاڈلی جب رابی اپنا سے دور ہوتی گئی
 تو آہستہ آہستہ اس نے اپنی خالہ امی کا سہارا لیا۔ اس آغوش میں بھی لاڈلی کو
 بڑا سکون ملا۔ خالہ امی کی گردن میں بائیں ڈال کر وہ جھول جھول جاتی خالہ
 نے بھی اپنی کوزاری امتنا سے سچ دی۔ لاڈلی ویسے بھی اس کی چیمٹی تو تھی ہی۔
 لیکن سوکھے ہوئے زرد پتے کی طرح جب وہ رابی اپنا کی مر جھاتی ہوئی شاخ
 سے ٹوٹ کر ادھر ادھر ہواؤں میں ڈول رہی تھی، پھوٹی آپنی نے اسے نہ حال
 کر رکھ لیا۔

بھائیں بھائیں کرتے گھر میں کوئی اور ننھا مٹا تو تھا نہیں۔ چولا ڈلی کسی سے کھلتی، لڑتی نہستی، روتی، رلاتی۔ جب بھی تنہائی کے احساس سے اس کا جی ادب جاتا، جب بھی ناٹے اس کے پھوٹے سے ذہن میں سائیں سائیں کرتے اور اکیلا پن ہر اس بن کر دل پر پھانے لگتا۔ وہ بکٹ ماں کی طرف بھاگتی۔ کیونکہ حادث بھائی دفتر چلے گئے ہوتے اور پھوٹی آپنی بے جا رہی بھنڈا سے گھر کے کام میں جٹ جاتی۔

رانی اپنا اس کو بے تحاشا اپنی طرف دوڑتا ہوا دیکھتیں تو دوری سے دونوں ہاتھ بڑھا کر پکار اٹھتیں۔ خدا را میری جان۔ خدارا میری بچی۔ اور لاڈلی ٹھٹھک کر اس طرح کھڑی رہ جاتی کہ تنہائی سے اکتا کر جس سمت وہ بھاگ رہی تھی اُدھر صرف تنہائی ہی نہیں بھیانک اندھیرا بھی ہے۔

اور اس بولتے ہوئے اندھیر نے آہستہ آہستہ ایک خوف سا لاڈلی کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے مسلط کر دیا۔ اب کبھی لاڈلی کا جی بھر آتا تو وہ خالہ امی پکارتی پھرتی۔ اور پھوٹی آپنی کے کانوں میں اس کی آواز کا رس ٹپکتا تو وہ بھی اس پر پتھا در ہو ہو جاتی۔

رانی اپنا پھوٹی آپنی کے دل میں لاڈلی کے لیے جب اتنی جگہ دیکھتیں تو ان کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتیں۔ رانی اپنا جان چکی تھیں کہ دلاسوں اور تسلیوں سے اب ان کی جلتی ہوئی روح کوئی تسکین نہیں پاسکے گا۔ وہ جسم جو اپنا رنگ روپ تنج کو ایسی تصویر کی طرح ہو جائے جو دھو

کھا کھا کر زرد کر پڑ گئی ہو تو پھر سادہ وجود تصور ہی بن کر رہ جاتا ہے اور رابی
 اپنا بس ایک چلتی پھرتی مری مری سی تصویر بن کر رہ گئی تھیں۔ اس تصویر
 کے ہونٹوں پر البتہ ایک ایسی زخمی مسکراہٹ چمکی ہوئی تھی جیسے کسی تصویر کو
 چھپانے کے لیے بھک سفید کاغذ چپاں کر دیا گیا ہو۔ اور یہ بھک سفید
 کاغذ دیکھنے والوں کو کتنا اکھرتا ہے۔ رابی اپنا کہاں اس بڑے سے گھر کا اجالا
 بنی ہوئی تھیں۔ کہاں، اب ہر گوشے اور ہر اندھیرے کے ساتھ ان تصویر
 ابھرتا تھا۔

لاڈلی تو ہر اس بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اب نہ وہ رابی اپنا کی
 طرف توجہ ہی کرتی نہ ان کی توجہ کی طالب ہوئی۔ اس کے پھوٹے سے ذہن نے
 اس بات کو قبول کر لیا تھا کہ رابی اپنا کوڑے کو کھٹ کا ایک ایسا ڈھیر ہیں جس کو
 پھونے سے کچھ اکھن سی ہوتی ہے۔ رابی اپنا سے جب وہ اس طرح دور ہو گئی
 تو ان کی مانتا نے آہستہ آہستہ سکنا سیکھ لیا۔ لاڈلی دن دن بھر رابی اپنا
 کے کمرے کا رخ ہی نہ کرتی۔ اور وہ گھر ہی میں رہ کر بھی اس کی صورت کو ترس کر
 رہ جاتیں۔ کبھی مانتا کے پرسکون سمندر میں ایسی موجیں اٹھتیں جھنیں رابی اپنا
 خود بھی نہ دیکھ پاتیں۔ صحن محووس کر سکتیں تو وہ جھکے سے دالان میں چلی آتیں۔
 دور کھڑی لاڈلی کو اتنی پیار بھری نظروں سے دیکھتیں جیسے چوم رہی ہوں۔
 پھر کچھ بات ہی کو لینے کے لیے اسے پکار کر پھیرتیں تو وہ نظر اٹھائے بغیر ہی رخ
 سے کچھ اوٹ پٹانگ سا جواب دے دیتی اور رابی اپنا کی زخمی مسکراہٹ اپنی
 بے بسی کو چھپانے کے لیے ان کے خشک ہونٹوں پر پھیل جاتی۔

ان ہونٹوں پر جن پر پٹریاں بن گئی ہوں، مسکراہٹ چاند کی کون تو بن نہیں سکتی، سوئی کی نوک بن جاتی ہے، اور اپنے ہونٹوں پر سوئی کی اس نوک کو رانی اپنا علائقہ محسوس کر لیتیں۔ بھوٹی آپنی یہ منظر دیکھ کر اس طرح انجان بن جاتی جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

حادث بھائی کا مصلیٰ تو تخت پر بس بکھا کا۔ بکھا ہی رہتا۔ ایک کونہ موڑ کر وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور اس طرح گویا عبادت کے اختتام کا اعلان ہو جاتا پھر دفتر جانے کی تیاریوں میں اس طرح لگ جاتے کہ بات کرنے کی بھی جیسے فرصت نہ ہو۔

رانی اپنا جب سے پڑ گئی تھیں چھوٹی آپنی کے سر پر اتنا کام اڑا تھا کہ اُسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ پتہ نہیں صبح شام بال سنوار لینے، آنکھوں میں کا جل پھر لینے اور چہرے پر الٹا بڑھا پوڈر مل لینے کے لیے وہ کس طرح وقت نکال لیتی تھی۔

ہر شخص مصروف ہو گیا تھا۔ ہر چیز جہاں کی تھاں تھی۔ زندگی کے قدم جو رانی اپنا کی بیماری کے اعلان کے بعد کچھ اکھڑا کھڑے گئے تھے اب پھر ٹھیک ٹھیک پڑنے لگے تھے۔ وہ ناؤ بوڈو لگا گئی تھی۔ اب ادھیرے ادھیرے بہہ رہی تھی۔

جب سبھیوں کا پھینا ہوا سکون سبھیوں کو واپس مل گیا تو رانی اپنا سمجھ بیٹھیں کہ حادث بھائی اور چھوٹی آپنی نے ان کی بیماری سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور اب تنہا مقابلہ کرنے کے لیے رہ گئی ہیں۔ اب رانی آپا ادس کا وہ قطرہ تھیں جو پچھو

کی پنکھڑی پر نہیں سوئی کی ٹوک پر ٹھہرا ہوا کھڑی دوپہر کا قنطر تھا کہ سورج سر پر چمکے اور تحلیل ہو کر اس اذیت سے ٹھکرا پائے جس کا نام زندگی ہے۔
 حادث بھائی نے رابی اپیا کے علاج معالجہ میں پہلے پہلے تو کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جتنا بن پڑتا کرتے۔ بساط سے زیادہ ہی انھوں نے کیا اور اب بھی مقدور بھر کر رہے تھے۔ لیکن رابی اپیا کا دکھ درد علاج کے سوا اور بھی تو کچھ چاہتا تھا۔ اور یہ چاہت سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ حادث بھائی، چھوٹی آپنی اور لاڈلی سب مل جل کر ان سے ان کی تنہائی کا احساس چھین لیں۔ لیکن اب یہ مشکل تھا۔

لاڈلی کے دل میں آہستہ آہستہ پتہ نہیں کیسے کیسے جند بوں نے سر اٹھایا کہ وہ سرے سے رابی اپیا سے بغاوت کر بیٹھتی۔ اس کی اس باغیانہ روش پر نہ کوئی ٹوکنے والا تھا نہ کوئی سمجھانے والا۔ وہ جان گئی تھی کہ رابی اپیا گھر کا وہ بے مصرف کمرہ ہیں جو گھر میں داخل ہونے ہی مقفل کر دیا گیا۔ ایسا درخت جو پھل پھول ہی دے سکے نہ ٹھنڈا سایہ۔ گھر میں اُسکے تو کیا، جنگل میں اُسکے تو کیا۔ بس لاڈلی تو رابی اپیا کو کچھ ایسا ہی درخت سمجھتے تھی۔ اس کے لیے تو جو کچھ پھر چھوٹی آپنی تھیں۔

”خالا امی بھوک لگی ہے۔“

”خالا امی کپڑے بدل دو۔“

”خالا امی آج اسکول میں نہیں جانے کی۔“

”خالا امی چاکو بار کھلا دو۔“

راہی اپیانے سوچا، معبود میرے۔ تیرے ان گنت احسانوں میں یہ بھی ایک ہے کہ لاڈلی کو اس کی خالہ امی سے مانوس کر دیا۔ ورنہ وہ ماں کی محبت کے لیے ترس ترس جاتی۔

اب راہی اپیا سرتا یا صبر و شکر بن کر رہ گئی تھیں۔ لاڈلی تو بھول بھال گئی تھی کہ راہی اپیا اس کی ماں ہیں۔ وقت پڑنے پر وہ کبھی انھیں اتنی پکار لیتی تو راہی اپیا جیسے سوتے میں چونک پڑتیں ورنہ وہ تو اب راہی اپیا کو خاطر ہی میں نہیں لاتی تھی۔

لاڈلی کے اس رویے کو حادث بھائی اور چھوٹی آپنی نے اپنی ایک سخت خاموشی سے جیسے جائز قرار دے دیا تو راہی اپیا کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنا سماجی موقف بھی اسی گھر میں کھو رہی ہے۔ وہ جس کے اشارے پر گھر کی کایا پلٹ ہو جاتی تھی، اب ہر ایک کے رحم و کرم کا منتظر تھا۔ بس کوئی شے اس کے اپنے بس میں تھی تو وہ زخمی مسکراہٹ تھی جو سوکھے ہونٹوں پر یوں معلوم ہوتی جیسے ترخی ہوئی زمین پر پیلی پیلی دھوپ کا سماں۔ اور اس مسکراہٹ کو راہی اپیا نے کچھ اتنی مجبوری سے اپنے ہونٹوں پر ضرور ٹٹا بکھر لینے کا اہتمام کر رکھا تھا کہ انھیں مسکراتا ہوا دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی جیسے کوئی سچائی کا مہذبند کر کے چنچ کر جھوٹ کہہ رہا ہو۔

معبود میرے — کتنی ہی بار تو وہ مسکراتے وقت وہ پاگل سی لگتی ہیں۔ واقعی راہی اپیا کو دق کے بجائے کوئی دماغی مرض لاحق ہوتا تو شاید ان کے لیے بہتر ہی ہوتا۔ آدمی کا ذہن مآذوف ہو جائے تو اپنی سوچوں کے زہر سے

تو وہ محفوظ ہو جاتا ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے رابی اپنی طبیعت کچھ زیادہ ہی خواب رہنے لگی تھی۔ کبھی کا بے سہارا ہو جانا اُسے بڑا طاقت ور بھی تو بنا دیتا ہے۔ ہوا کے بھونکوں سے جلتے ہوئے چوڑی کی کو کو بچانے کے لیے کوئی ہاتھ حفاظت ہی نہ کر سکے تو سمجھ لودیا جلے یا بجھے، فرق کوئی پڑنے والا نہیں ہے۔ رابی اپنا یہ سب کچھ جان گئی تھیں۔ اسی لیے تو اب یوں بھی ہونے لگا تھا کہ سینے کے درد کو ہاتھوں سے دبائے وہ چپکے سے کسی رات کو خون تھوک آتیں تو صبح ہونے پر بھی سونے والوں کو بتانہ چلتا۔

زندگی ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیتی ہے۔ موت کا وہ کبھی ساتھ نہیں دیتی۔ ان دنوں میں اشراف سطلے کا یہ ہے۔ دو قدم ساتھ چلتے ہیں تو کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کا گلا دبوچ لیتا ہے۔ اور یہ فتح و شکست جتنی کم مدت طے پاس کے اتنا ہی آدمی کے لیے اچھا ہے۔ لیکن رابی اپنی زندگی اور موت نے جیسے آپس میں کچھ سازش کر لی تھی۔ نہ یہ اُس پر وار کرتی تھی نہ وہ اس پر۔ دونوں ٹھکرائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے خائف تھے۔ پتا نہیں کب کب جل دے جائے۔ اور رابی اپنا خون تھوک تھوک کر پاگلوں کی طرح مسکرا رہی تھی۔

آج سویرے سویرے ہی رابی اپنا بڑے کوب میں مبتلا تھی۔ اس کو کیا ہو رہا تھا یہ تو کتنا مشکل ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں کچھ اس طرح جاگ رہی تھیں، جیسے بس اب سو جانے والی ہوں۔ آج صبح صبح اس کے ہونٹوں پر اس کی وہ

تخصیص مسکراہٹ بھی نہیں تھی جس سے وہ پاگل ہی نظر آتی۔ اور جی چاہتا کر رانی
ایسا کچھ تو نظر آئے۔

اس وقت — اس وقت اگر میں تمہیں کچھ دے سکتا رانی ایسا — تو
موت دے دیتا — اور تم جانتی ہو کہ تمہارے لیے اس سے زیادہ خوبصورت کوئی
تحفہ نہیں ہے، لیکن ہم سب بندے عاجز ہیں۔ مجبور ہیں۔ کسی کو موت بھی تو
نہیں دے سکتے۔

لیکن تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ تمہاری موت نے جہل سے
کو اپنے شکستے میں لے لیا ہے اور تمہارا یہ سوتا جاگتا چہرہ کیا اسی اطمینان کا باعث
تو نہیں ہے۔

وہ اصل ہوا یوں کہ رانی ایسا کے رات سینے میں درد اٹھا۔ وہ اپنے
سینے کو دبا کر سنبھلی تو اس کا منہ خون سے بھر گیا اور ہلنگ کے پاس پیک دان
نہ پا کر وہ قریبی راستے سے صحن کی طرف لپکی تو کمرے میں بستر پر حادث بھائی نے
چھوٹی آپنی پر جھکے ہوئے تھے۔ آہٹ پا کر انھوں نے اپنے کو بھوٹی آپنی کے
لحاف میں چھپا لیا۔

رانی ایسا خون تھوک کو لوٹ رہی تھی تو وہ بے حد نڈھالی تھی۔ دیواروں
کا سہارا لے کر وہ پھر اسی کمرے سے ہو کر گورنر کے لیے بھجور تھی۔ اپنیتے ہوئے
جب وہ اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو دک کر اس نے لحاف کی طرف نظر
اٹھائی لیکن اس کی نظر لحاف سے ہٹ کر لاڈلی پر ٹھہر گئی جو لحاف کے برابر ہی بے سند
سو رہی تھی۔ اس نے لاڈلی کو اس طرح دیکھا جیسے آنکھوں میں آنکھوں میں آنکھوں

بار چوم رہی ہو اور نہ چھلتی ہوئی اپنے پلنگ تک پہنچ کر پڑ رہی۔
صبح چھوٹی آئی جب رانی اپیا کے برتنوں میں جو الگ رکھے جاتے تھے
کچھ تلاش کرنے آئی تو رانی اپیا نے بہت غور سے اس کی آنکھوں میں بھیلایمیل
کا جل دیکھا جو کہیں کہیں گالوں پر بھی نمایاں تھا۔

”کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“ — رانی اپیا نے کچھ اس طرح سے پوچھا جس نے
اُن کی اپنی کوئی چیز کھو گئی ہے اور چھوٹی آئی کھونج کو ہتھیلنا چاہتی ہے۔
”گلاس ڈھونڈ رہی ہوں اپیا — بہت پیاس لگی ہے۔“
رانی اپیا کی وہ آنکھیں جو اب سو جانے والی تھیں، اس طرح چمک
اٹھیں جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیدار ہو گئی ہوں۔
کچھ سوچ کر انھوں نے برابر کی تپانی پردے کھلے ہوئے گلاس کی طرف اشارہ
کر کے کہا۔

”یہ دھرا ہے۔ پی لو!“ چھوٹی آئی نے لمحہ بھر کے تذبذب کے بعد ہاتھ
بڑھا کر گلاس اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا رہی تھی کہ آواز آئی ”خالہ امی۔ خالہ
امی، تم کہاں ہو؟“ بدن کی ساری قوت سمیٹ کر رانی اپیا اپنے بستر سے اچھل
پڑیں۔ دیوانوں کی طرح انھوں نے ہاتھ مار کر پانی کا گلاس گر ادیا جو چھوٹی آئی
کے ہونٹوں تک پہنچ چکا تھا۔ یہ ست پیو — مت پیو یہ — یہ میرا بھوٹا ہو۔
گلاس چھوٹی آئی کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹا نہیں۔ وہ رانی اپیا کے
پلنگ پر گر پڑا تھا۔ اور پانی بستر اور فرش پر پھیل کر جذب ہو رہا تھا۔ پیاسی
چھوٹی آئی یاد دیرے پھاڑ کر رانی اپیا کو تک رہی تھی جو ہانپتی ہوئی نہ ڈھال

ہو کر اپنے تیکے پر گر پڑی تھیں۔

”جاؤ“ — مری ہوئی آواز میں رابی اپیانے کہا۔ ”مسفہ ہاتھ دھو لو۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔ نہ کنگھی نہ چوٹی۔ نہ اینٹ نہ خازہ۔ مارش اور لاٹولی ناشتے پر بھٹا دے منتظر ہوں گے۔ اتنی دیر گئے جاگتی ہو۔“

— — —

کہنڈر

میں نے ایک گلستاں کو دیرانے میں تبدیل ہوتا ہوا اس طرح دیکھ لیا۔
 جیسے کہیں کچھ ہوا ہی نہیں۔ بعض حادثے، بعض سانحے کچھ کھچی زندگی کا رخ،
 موڑ دیتے ہیں۔ خود میں نے بھی اپنی چین درچین زندگی کے سب سے بڑے شاداب
 اور بار آور پھول کو ایک لمحہ بھر میں زندگی کی ہری شاخ سے ٹٹتے ہوئے دیکھا
 ہے۔ میں نے سمجھ رہی تھی کہ وہ لفظ کسی سے نہیں مانگے۔ اپنی چپ پر بھی اگر یہ گمان
 ہوا ہے کہ کوئی اس چپ کے سہارے میرے دل کی آواز تک پہنچ رہا ہے تو میں
 نے باتیں کی ہیں، ایسی باتیں جن میں درد و رنج کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اور نہ ہی
 کا ہر لمحہ میں نے اسی انجمن نامہ میں گزارا ہے، جس انجمن کو اس جیتی جاگتی دنیا سے
 اٹھا کر میں نے اپنے تار یک سینے میں پھپھایا ہے اور میں زندہ ہوں، بڑے

ٹھاٹھ سے، بڑے ٹھٹے سے۔ کس میں ہمت ہے جو یہ کہہ سکے کہ یہ آنکھیں جو اب بھیگی ہوئی ہیں۔ ان میں آنسو اڑ آئے ہیں۔ کوئی ان آنسوؤں تک پہنچ رہا ہوتا ہے تو میں اپنا جلتا ہوا سگریٹ بڑی بے نیازی سے دور پھینکتا ہوں کہ بکھت سارا دھواں بس آنکھوں ہی میں گھس آیا۔ لیکن کوئی کب تک اس دردناک جھوٹ کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اب مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

بات میں نے شروع کوئی چاہی تھی ایک پاگل سے، ایک دیوانے سے، ایک مجذوب سے، جو زمانہ طالب علمی میں میرا ہم جماعت تھا۔ لیکن بات میں نے کی، اس باہوش دینے کی، جو اس پاگل کو اس عالم بے بسی میں دیکھ کر افسردہ و غمزہ ہو جاتا ہے۔

وہ بیک ایک مجھ سے سڑک پر ملا۔ برسوں کے بعد۔ مدتوں کے بعد۔
 ”اے۔ مجھے دوا آئے دے دے۔“

اور میں اُسے دیکھا کا دیکھا رہ گیا۔
 ”نواب شرافت اللہ خاں“

”حاضر جناب۔“

ادارہ علوم شریف میں اردو کے استاد صاحب حاضری لینے کے لیے اس کا نام پُچھتے تو اس کو خوش کرنے کے لیے نواب، بطور خاص اس کے نام کے ساتھ لگا دیتے۔
 اردوہ ان کی ضرورتوں کا کفیل ہوتا۔

”ایک روز شرافت نے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔“

”آپ صرف میرا نام پکارا کیجئے۔ نواب کہنے سے مجھے نوشی نہیں ہوتی اور نہ میں اس کو باعثِ توقیر سمجھتا ہوں۔“

پھر وہ حاضری کے وقت شرافت اللہ خاں پکارا جانے لگا لیکن اڈ کے مولوی صاحب کی ضرورتوں کی کفالت بدستور اس کے ذمہ رہی۔

آج یہ دیوانہ میرے مقابل کھڑا مجھ سے دو آنے مانگ رہا تھا تو میں نے پیچھے لوٹ کر نواب شرافت اللہ خاں سے ادارہ علوم شریعہ میں مل رہا تھا۔ اس کے چہرے کی مشکفتگی بے شمار لکڑوں کے پیچھے اس طرح چھپ گئی تھی جیسے کوئی نغمہ ساز دکانی لکڑوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔

”دے دے دو آنے۔ دیتا ہے کہ جاؤں۔“

میں نے اس کو کریدنا چاہا۔

”تم شرافت اللہ خاں ہو؟“

”ہاں، ہوں۔ اب دے بھی دے دو آنے۔“

”کیا کرو گے؟“

”چائے پیوں گا دے۔“

”مجھے پہچانتے ہو؟“

”نہیں دے۔“

اور اس نے اپنے دائیں، بائیں دیکھ کر سڑک پر اس طرح تھوک دیا۔ جیسے ساری دنیا کے صفحہ پر تھوک رہا ہو۔ پھر وہ متواتر تھوکتا رہا۔ خود اپنے کپڑوں پر بھی اس نے تھوک لیا تھا۔ اس کے جسم سے بدبو آرہی تھی۔ اس کی

کشافت اور گندگی نے مجھ میں کراہت کا احساس پیدا کیا اور میں نے جیب سے دو آنے نکال کر اس کو دے دیے۔ کچھ کہے بغیر وہ ادبیا کیفے کی طرف چلا گیا اور میں نے بھی اپنی راہ لی۔

بس اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے شرافت اللہ خاں خاں میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا اور میں بس کے منتظر مسافروں کے کیو میں اپنے لیے جگہ بنا رہا تھا۔
دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ وہ پھر مجھ سے ملا۔

”اے۔۔۔ دو آنے دے دے۔“

میں نے ٹال جانا چاہا۔ میری جیب خالی تھی۔ بس کے کرائے کے لیے اس تک پہنچنے کو صرف ایک آنا تھا۔

”نہیں ہیں یا، ورنہ ضرور دے دیتا۔“

”جو کچھ ہے دے دے۔“

”نہیں، اس وقت نہیں رکھ“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کتنی دیر ان تھیں اس کی آنکھیں اتنی کہ آپ سچ پوچھیے تو ان آنکھوں کو دیکھ کر صرف دیر آنے کا تصور بھی ذہن میں نہیں نظر بلکہ کچھ ایسا احساس ہوتا تھا۔ جیسے کسی ویرانے میں بدردہیں انسان کی تباہی کے لیے سرگوشیاں کر رہی ہوں۔

میں نے قدم بڑھا دیا وہ بھی پیچھے ہوا۔

”لا۔۔۔ سگریٹ دے جا۔“

میں نے دو چاد سگریٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

”کہاں رہتے ہو آج کل؟“ میں نے پوچھا۔
 ”یہیں۔“ اس نے شاہ صاحب کے تیکے کی طرف انگلی اٹھا دی۔
 ”اچھا۔ تب ہی تو اسی گلی میں نظر آتے ہیں۔“
 ”ہندوستان بھر بھر چکا ہوں۔ دلی اجاڑ دی۔ تاج محل برباد
 کر دیا۔ بہت بُرا کیا۔ بڑا بد نصیب ہوں۔“
 ”اجاڑ دی دلی؟“

”ہاں۔“

”کیوں بھلا؟“

”بس تھوک دیا آنگ لگ گئی۔“

”اچھا یہ بات ہے۔ اور تاج محل؟“
 ”تاج محل پونہ میں مل گیا۔ وہاں کے پتھر اکھاڑ لایا۔ تاج محل
 میں بڑا اندھیرا ہے۔ تو بھی قبر کے خدا بے ڈرتا ہے نا؟“
 میں نے اس کی اوٹ پٹانگ باتوں پر مسکراتے کی کوشش کی یہ اور بات
 ہے کہ مسکرا نہ سکا۔

میں آگے بڑھ گیا تو وہ شاہ صاحب کے تیکے پر سایہ یکے ہوئے گھنے
 پیل کے نیچے جا بیٹھا۔

اب میں جب کبھی ادھر سے گزرتا، شاہ صاحب کے تیکے کی جانب غیر
 ارادی طور پر میری نظریں اٹھ جاتیں۔ وہ اکثر آنکھیں بند کیے ہوئے بیٹھا کچھ
 بڑبڑاتا رہتا اور بار بار اپنے اطراف تھوکتا رہتا۔ میں بھی دبے پاؤں گزر جانے

ہی میں اپنی عافیت سمجھتا۔

ایک روز اس نے مجھے لکھا۔

”چوروں کی طرح بھاگ رہا ہے مے“

واقعی جیسے میں چوری کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔

”بھاگ کہاں رہا ہوں۔ میں تو پیر دبا کر اس لیے گھر رہا تھا کہ تم میاں

کے دھیان میں ہو“ وہ اشرم میاں کو بڑے پیار سے میاں کہا کرتا تھا۔

”دیکھ میاں نے بھیج دیا نا تجھے۔ لا ملا دے جائے“

میں نے سوچا۔ آج جی بھر کر اس کو تنگ کر دوں گا۔ اس کی پھپھلی زندگی

یاد دلاؤں گا۔ دیکھوں گا کہ وہ اپنے ماضی کے کھنڈر سے کچھ سا تھک بھی لے آیا

ہے یا سب کا سب چھوڑ آیا ہے۔

”دیکھو میں تمہیں بھی چائے پلاؤں گا۔ کھانا بھی کھلاؤں گا لیکن تم مجھے

بہچاؤ کہ میں کون ہوں“

”چل تو کیا کھانا کھلائے گا مجھے۔ کھانا تو میاں کھلاتا ہے“

”تو پھر چائے بھی میاں ہی سے پی لو“

اس نے دو چار بار زمین پر تھوک دیا۔ میں نے اس کو خیال کو اپنے ذہن

سے نکال دیا کہ وہ میرے صفحہ پر تھوک رہا ہے۔ پھر یکایک وہ تیکے کی طرف جانے لگا۔

میں نے کہا ”سنو تو“

”جا نہیں سنتا“

”تم اتنی جلدی خفا کیوں ہو جاتے ہو؟“

”نہیں، رے میں کسی سے خفا نہیں ہوتا۔ خفا تو صرف میاں سے ہوتا ہوں۔ وہ قبر کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ تو میں خفا ہو جاتا ہوں۔ ہی ہی ہی۔ سی سی سی۔“ وہ دونوں ہاتھ اپنی غبلیوں میں دبائے وہ سرتا قدم کانپنے لگا۔ ایسے جیسے شدید ٹھنڈ محسوس رہا ہو۔

”یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“

لیکن وہ یہاں ہو تو میری آواز بھی سُنے۔ میں کھڑا کھڑا پتہ نہیں کہا جا پہنچا تھا۔

میں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک راہ گیر سے ملتی جلتا انداز سے کہا کہ سامنے والے ہوٹل سے وہ ایک پیالی چائے بھجوا دے۔ چائے آئی تو شرافت انڈر خاں کو میں نے بلند آواز سے پکارا جیسے فاصلے سے پکار رہا ہوں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں تو میں نے چائے بڑھا کر کہا نیو۔

اس نے گرم گرم چائے منٹ بھر میں خالی کر کے کپ مجھے لوٹا دیا تو میں نے سگریٹ پیش کیا۔

سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”تو کون ہے رے؟“

میں نے موقع کو غنیمت جانا۔

”ادارہ علوم شرقیہ یاد ہے تمہیں؟“

ایک چمک سی اس کی آنکھوں میں اس طرح لہرائی جیسے گھپ اندھیرے میں جگنو چمک اٹھا ہو۔ جگنو کی اس چمک میں تجھے امید کی کرن نظر آئی اور

میں اس کے ماضی کے کھنڈر میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ وہاں
ادارہ علوم شرقیہ میں تمہارے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک بار تم مجھ سے گھگھڑپے
تھے۔ وہ مولوی صاحب تھے نا، ان کا اچھا سا نام تھا کچھ۔ جو تہیں نواب
پکارنے تھے اور جنہوں نے سنا ہے کہ خود کشی کھولی۔ اور وہ۔۔۔ وہ لڑکی،
کیا نام تھا اس کا۔ وہی یار سیاہ برقعے والی۔“

میری باتیں سنتا ہوا وہ ٹکٹکی باندھے فضاؤں میں کچھ اس طرح گھولنا
رہا جیسے میرا ہاتھ تھا ہے خود بھی اپنے ماضی کے کھنڈر میں داخل ہونے کی کوشش
کر رہا ہو۔ پھر یکایک جیسے کسی چیز سے ڈر کر وہ بکسٹ واپس بھاگ آیا۔
”جا تو بھی مر جا۔“ سی سی سی اور اس پر وہی سردی میں یکپانے کی سی
کیفیت طاری ہو گئی۔

”قبر کے عذاب سے تو بھی ڈرتا ہے نا؟“

اور میں نے اس جیتی جاگتی قبر کو شاہ صاحب کے تکیے پر پھوڑ کر آگے
بڑھ جانا ہی مناسب سمجھا کیونکہ مجھے اس کی زندگی کے عذاب سے وحشت
ہو رہی تھی۔

دھبی، دھبی کبرطوں میں لبوس، اپنے تار تار دامن کے ساتھ وہ قریب
قریب روز ہی مجھے نظر آتا۔ کبھی اس کی نظر مجھ پر نہ پڑتی تو میں چپکے سے نکل جاتا۔
کبھی وہ مجھے دیکھ لیتا تو خود کچھ اس عالم میں ہوتا کہ خالی خالی نظروں سے
صرف مجھے دیکھتا رہ جاتا، کبھی ہوش و حواس بجا بہتے تو تیز تیز مجھ تک
آپہنچتا یا کبھی پکار کر روک لیتا۔

”نواب - نواب - نواب - چائے پلاوے دے۔ آج تو سگریٹ بھی نہیں ہیں دے۔“

چائے کے لیے پیسے دے کر میں اُسے سگریٹ کا پیکیٹ پاس کی دکان سے دلا دیتا جہاں میرا اکاؤنٹ تھا۔

ایک شام میں نے لٹ و دق ریگزار میں موج در موج آبِ رواں ٹیکہ لیا۔

ایک شام میں نے چٹانوں کے سینے میں کچی کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھ لیا۔
ایک شام میں نے اُلٹے ہوئے کفن میں زندہ گی کو کھساتے ہوئے دیکھ لیا۔
ایک شام میں نے دیکھا کہ شرافت اشرخاں صاف سقری شیروانی، تھل کی دہلی اور اٹھ بڑے اطمینان اور تکنت سے، سڑک پر کہیں جا رہا ہے، اس وقت میں ایک بکٹ کی دکان پر کھڑا اپنے دو سالہ بچہ کی فرمائش پوری کر رہا تھا۔ میں نے شرافت اشرخاں کا پچھاوا دیکھا تھا۔ اس یقین کے باوجود کہ وہ وہی ہوگا، میرا دل اس کھلی حقیقت کو مان لینے سے منکر تھا۔ اگر وہ یکایک میرے سامنے آجاتا اور مجھ سے ملنے کے لیے پہل کرتا تو بھی میں اسے پہچاننے سے شاید انکار کر دیتا۔

بین لٹ و دق ریگزار میں موج در موج آبِ رواں کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔

میں چٹان کے سینے میں کچی کلیوں کو کھلتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔
میں ہاتھ کو سجھائی نہ دینے والے اندھیرے میں کرفوں کا نقص کس طرح

دیکھ سکتا ہوں کہ اندھیرا برقرار رکھی رہے۔
 میں لٹے ہوئے کفن میں زندگی کو کمساتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔
 اگر یہ سب کچھ ممکن نہیں ہے تو شرافت اللہ خاں کا یہ روپ کس طرح
 ممکن ہو گا۔

لیکن میں چٹکی ہوئی دھوپ سے کیسے ابھار کر دوں۔ شاہ صاحب کے
 تیکے پر شرافت اللہ خاں مجھے بھر سمجھی نظر نہ آیا تو میں نے قرب و جوار کے لوگو
 سے دریافت کیا۔ سبھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کسی نے قیاس آرائی کی کہ کسی
 دوسری درگاہ یا تیکے پر جا بسا ہو گا۔ لیکن ایک دن بس اسٹینڈ پر شرافت اللہ
 خاں مجمع میں سے نکل آیا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔
 ”دیکھ میں تیری دعا سے بالکل اچھا ہو گیا ہوں۔ تو میرا محسن ہے۔ میں
 نے تجھے بہت تکلیف دی ہے۔“

”نہیں شرافت ایسا نہ کہو یا ر۔“
 اس نے بڑی گرجو ششی سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”چلو میرے
 ساتھ چائے پیو۔“

میں بھی خوش خوشی اس کے ساتھ ہو لیا۔
 ہوٹل پہنچ کر اس نے بہت ساری چیزیں منگوالیں۔ نمکین سیٹھے بکٹ
 پیسٹری۔

میں نے کہا ”کیا کرتے ہو؟“
 اس نے کہا ”کیوں کیا تمہاری شرافت اس قابل نہیں ہے؟“

اداس نے اصرار کر کے مجھے کھلایا۔ بساط بھر تو اضع کی۔
 میں نے کہا ”سب کھالیں گے بھٹی۔ پہلے جی بھر کے باتیں تو کر لیں۔“
 ”دونوں جا رہی رکھیں۔ باتیں بھی یہ بھی۔“ اس نے خود پہل کی۔
 میں نے پوچھا ”تم نے اب بھی مجھے پہچانایا نہیں۔“
 ”اے کمال کون تے ہو یاد۔ ہزار بار پہچان لیا۔ تم شاعر دوست

ہو نا۔“

مجھے ادارہ علوم شرقیہ کے اپنے ساتھیوں کا یہ اندازِ تسخاطب فوراً
 یاد آ گیا جس کو میں بھولا ہوا تھا۔

”ہاں بالکل شاعر دوست ہوں۔“

”پھر کیا حال ہے شاعری کا؟“

”بھوڑ دی۔“

”کیوں؟“

”بس نہیں چلا ٹیو۔“

”نہیں جی تمہاری ادارے بھر میں دھوم مچی۔ پھر شہر بھر میں لوگ
 تمہیں جاننے لگے تھے۔“

”بد مذاق ہو گئے تھے لوگ۔“

”بھئی کمال کون تے ہو۔ اب کیا کون تے ہو؟“

”نوکری۔“

”بچے کہتے ہیں؟“

” ساڑھے تین “

” سمجھا — یعنی بھابی حاملہ “

” جی — آداب عرض “

” لونا “ اس نے پیٹری بڑھائی ۔

” بہت لے چکا — کچھ اپنی بھی تو سناؤ “

” کیا سناؤں — بہت دکھ اٹھائے ہیں یاد اس زندگی میں پتہ نہیں کب تک پاگل رہتا — آج وہ دیوانگی کی زندگی یاد کرتا ہوں تو کچھ بھرے خواب تو نظر آتے ہیں لیکن صاف صاف کچھ سمجھائی نہیں دیتا اتنا تو یاد ہے کہ تم سے ملتا رہا ہوں — تمہیں تنگ کرتا رہا ہوں — تم سے پیسے مانگے ہیں — لیکن تمہیں اس زمانے میں کیا سمجھتا رہا ہوں “

” نہیں تو — بتاؤ آخر — “

” وہ جو اپنے اداے میں ارادے کے اتار دیتے تھے — علی زور وہی میرے بارغ پر بچھائے رہتے تھے — جس کسی نے کبھی مجھ سے کچھ سلوک کیا میں انھیں علی زور سمجھ لیتا تھا — اس کی وجہ میں کچھ بھی نہیں جانتا “

میں نے بیچ ہی میں پوچھا —

” حالانکہ تم ہی ان کے ہر طرح کیفیل تھے — تم سے بھلا وہ کیا سلوک کر سکتے تھے — “

” انھوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا — اس داستان میں جواب میں نہیں سناؤں گا ان کے ارادے کا کہاں تک دخل تھا اور میری بد نصیبی کہاں تک

شامل تھی اس کا صحیح اندازہ تم کر سکو تو کرو۔ میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وقت آدمی کو ایسے زخم دے کہ گودر جاتا ہے کہ ان کا اندامال وقت کے بس کی بات بھی نہیں رہتی۔ ادویوں بھی یہ کیا ضروری ہے کہ کسی کا لگایا ہوا زخم اسی کے لگائے ہوئے مرہم سے منسلک بھی ہو جائے۔ علیٰ نذر جب اپنی ایماندار اور طویل ملازمت کی بنیاد پر ادارے کے خازن بھی بنا دیے گئے تو انھوں نے معلوم نہیں کب سے ادارے کی رقم اپنے تصرف میں لانی شروع کر دی تھی۔ جب یہ راز فاش ہوا تو وہ ردپوش ہو گئے۔

”ایک رات جبکہ میں اپنے دیوان خانے میں بیٹھا ہوا نیکمہ کی خط لکھ رہا تھا۔ مجھے دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ بنائی دی۔ میں نے کچھ دیر اس چاپ کو بغور سننے کی کوشش کی لیکن پھر کوئی آہٹ نہ ہوئی تو اسے داہنے پر محمول کر کے میں پھر خط لکھنے میں مچھو ہو گیا۔

”بہتیں نیکمہ تو یاد ہو گئی۔ وہی نیکمہ جو اپنے ادارے کی لڑکیوں میں رشادوں کے جھڑپ میں گھرے ہوئے چاند کی تمثیل سمجھی جاتی تھی۔

”وہی نیکمہ جس کے نشے میں ان دنوں میں چور تھا۔ وہی نیکمہ میرے دن جس کے نام سے منسوب تھے اور میری راتیں جس کے نام سے مشہور۔

”وہی نیکمہ جس کے لیے ادارے کے لڑکے کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی نوٹ بک پر صرف شرافت اللہ خاں کا نام لکھنا چاہتی ہے۔

”ہمارے ایک دوسرے کے لیے دیوانگی کی حد تک نیک دلی رسوائی کا باعث بننے کی بجائے نیک تمناؤں کا اظہار بن گئی تھی اس لیے کہ نیکمہ مجھ سے

منسوب کر دی گئی تھی اور کچھ ہی دن میں اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا
 جانے والا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ تم ادارہ چھوڑ چکے تھے۔
 وہ بڑے اطمینان سے اپنی داستانِ سنا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دور
 و دور تک کسی کرب یا درد کی پرچھائیاں نہیں تھیں۔ میں ہمدن گوشن تھا۔
 لیکن سناتے سناتے وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ پھر خود ہی چونک کر جیسے ماضی
 کے اس کھنڈر سے واپس لوٹ آیا۔ جس کھنڈر میں کبھی میرے سہارے وہ داخل
 ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن آج بڑے اطمینان سے کسی کی مدد کے بغیر
 ان کھنڈروں میں گھوم پھر سکتا تھا۔

سگریٹ سلگا کر کش لیے بغیر ہی وہ کہنے لگا۔

”اگر تمہیں یہ بھی بتانا چلوں کہ نعیم کے حصول کے لیے مجھے کن آزمائشوں سے
 گزرنا پڑا ہے تو داستانِ طویل ہو جائے گی۔ صرف اتنا جان لو کہ جہاں ایک نظر
 میں زندگی کی ساری پونجی، ایک ایک سانس، دولت میں نے نعیم کے قدموں میں
 رکھ دی وہیں نعیم نے جھک کر سب کچھ بڑے چاؤ سے اٹھا لیا اور اپنے سینے میں
 چھپا لیا۔ تم دیکھو جی کہ دل کے اس معاملہ میں بیک وقت میری طرح خوش نصیب
 اور بد نصیب کوئی ہو بھی سکتا ہے۔ بات میں نے آگے بڑھائی تو میرے گھر والوں
 نے بخوشی منظور کر لی۔ پیام بھیجی گیا تو نعیم کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔
 میں اس طرح جیسے کسی منہ نے چاند پر لپکا کر ہاتھ بڑھایا تو چاند اس کے قبضے میں
 تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہوئی اور میں دن گنتے لگا۔ ایک ایک منٹ ایک ایک
 دن اور ایک ایک دن ایک ایک برس لگتا تھا۔ میں یہ سوچ کر ہی ٹپٹپٹا

تھا کہ وہ لوگ ہجر کی لمبی راتوں کو اپنا مقدر بنتا ہوا دیکھتے ہوں گے۔ وہ کس طرح زندہ رہ پاتے ہوں گے۔ وہ ساعت قریب تر ہو رہی تھی جو میرے لیے زندگی سب سے بڑی نعمت بننے والی تھی۔ اس اثنا میں نعیمہ کو میں نے محبت کے خطوط لکھے تھے اور اس کی جانب سے محبت کے جواب پائے تھے۔ ہم نے نامہ پیام کی اس مختصر سی مدت میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کا سب کچھ مان لیا تھا۔

وہ پھر کچھ خاموش ہوا۔ سگریٹ کا گُل جھاڑ کر اس نے کش لیا اور دھواں چھت کی طرف پھوڑ کر کہنے لگا۔

”نعیمہ نے مجھے ایک خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ اس نے ہمارے ایک دوسرے سے منسوب ہونے کے فوراً بعد ہی مجھے لکھا تھا کہ اپنے خاندان کے ایک لڑکے سے وہ بچپن ہی سے منسوب تھی لیکن اس کے چال چلن، اس کی آواز لگی اور بھالت کے باعث نعیمہ کے والدین نے انھیں ٹکاسا جواب دے دیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے خاندان میں بڑی کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اور عاشق نامراد، میری مراد میرے رقیب سے ہے، میری جان کا درپے تھا۔ خیر وہ میری جان تو کیا لیتا، خوف و ہراس پیدا کر کے اس نے میرے گھر والوں کو وحشت زدہ ضرور کر دیا تھا۔ ایک بار مجھ پر حملہ کیا بھی تو اس کے دل کی دل ہی میں رہ گئی لیکن اس وقت میں ذرا محتاط ہو گیا تھا۔ ادھر نعیمہ کا یہ عالم تھا کہ ہر خط میں مجھے ہوشیار رہنے کے لیے کھتی اور میری سلامتی کی دعائیں مانگتی۔

اس رات جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں دیوان خانے میں بیٹھا نعیمہ کو خط لکھ رہا تھا کہ میرے دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قدموں کی یہ چاپ بڑے ڈرامائی انداز سے آ رہی تھی، کوئی تیز تیز دروازے میں چلتا۔ دروازے میں چونکہ پالش کیے ہوئے پتھروں کا فرش تھا اس لیے بہت نمایاں طور پر اس سٹاٹے میں کافوں کے پردوں پر یہ چاپ اپنا تاثر چھوڑ رہی تھی۔ عام حالات میں شاید اس کو اتنی اہمیت نہ دیتا۔ میں خود چونکہ پہلے ہی سے محتاط تھا، اس لیے خوف ہراس کی اس بو بھل فضا میں ایک وحشت سی مجھ پر مسلط ہو گئی تھی۔ وہ شخص جو باہر ٹہل رہا تھا اس کے ایک ایک قدم کی چاپ اس کے اٹل ارانے کا پتہ دے رہی تھی وہ ٹہلتا ٹہلتا اس طرح رک جاتا جیسے رات کے سٹاٹے کو شدت سے محسوس کر دانے کا بطور خاص اہتمام کر رہا ہو۔ واقعی وہ چپ ہو جاتا تو میں فرش پر سوئی گواگو اس کی آواز تک سن سکتا تھا۔ پھر یکایک وہ اسی تیزی سے فرش پر چلتا جیسے کسی کو دیونچہ رہا ہو، کسی پر حملہ کر رہا ہو۔ میں حیران اس بات پر بھی تھا کہ وہ میرے دروازے تک کس طرح پہنچ سکا ہے اور پھر اس طرح ٹہلتے رہنے سے اس کا کیا مقصد ہے۔ نہ وہ دروازہ ہی کھٹکھٹاتا ہے۔ نہ مجھے بکا رہتا ہے۔ میں نے آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ کون ہو۔؟

کوئی جواب نہ ملا۔

”کون ہو۔ بتاتے ہو کہ گولی چلا دوں۔ میں تمہیں دکھائی نہیں دے

رہا ہوں۔ لیکن تم مجھے صاف دکھائی دے رہے ہو؟

”میں ہوں۔ علی زور۔“

میں نے آواز پہچانتے ہوئے بھی مزید اطمینان کر لینا چاہا۔

”کیا کہا۔ کون ہو؟“

”میں علی زور ہوں شرافت۔ باد رازہ کھولو۔“

اس کے باوجود میں نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا وہ علی زور ہی

تھے۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا: ”تم میرے متعلق سب کچھ جانتے ہو نا؟“
ہاں میں نے کہا: ”اچھی طرح جانتا ہوں، پولیس آپ کا پیچھا کر رہی

ہے۔“

”پھر یہاں رات کے رات ٹھہرنے دو گے مجھے؟“

میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے پوچھا۔ آپ اتنی دیر سے باہر کیوں ٹہلتے

رہے۔

علی زور نے مجھے بتایا کہ وہ اس بات سے ڈر رہے تھے مبادا میرے بچائے
میرے آبا سے ملاقات ہو جائے تو وہ کہیں انھیں پولیس کے حوالے نہ کر دیں
اسی لیے ڈرامائی انداز سے انہوں نے قدموں کی چاپ سے کام لیا تاکہ میں
خود ان سے کچھ پوچھوں اور وہ آواز پہچان سکیں۔

علی زور بے حد مطمئن تھے۔ کسی قسم کی پریشانی یا تفکر کے آثار ان
کے چہرے پر قطعی نہ تھے سگریٹ جلایا اور کہنے لگے جاؤ اب آرام کو دو رات

زیادہ ہو گئی ہے۔ مجھے کبھی پو پھٹنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جاتا ہے۔
میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے اپنی مذموم حرکت کی نسبت کوئی گرفتار کرنا نہیں چاہتے
ہیں لیکن مجھے بُرا یہی لگا کہ ان کے پہرے پر احساس شرم کا کہیں پتہ نہ تھا۔
ندامت کے کوئی آثار نہ تھے۔

میں نے اپنا بستران کے لیے بھوڑ دیا اور خود مکان کے اندر دینی حصے
میں چلا گیا اور نعیمہ کی لکھا جانے والا خط آج تک ادھورا ہے۔

پو پھٹی۔

صبح ہوئی۔

سورج نکلا۔

دن چڑھا۔

لیکن علی زور نے اندر سے دروازہ نہ کھولا۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں
نے صدر دروازے سے باہر کی جانب برآمدے میں جا کر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن
کچھ حاصل نہ ہوا اگر وہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور اس شور پکار سے آبا کو
پتہ چل جاتا تو پھر میرے لیے ان کو چھپا کر فرا کر دانا بھی مشکل تھا۔
میری تشویش جب بڑھی تو آبا کو اطلاع کرنے اور دروازہ کو توڑ کر اندر
داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

دردازہ توڑا گیا۔

علی مذہر نیچے فرش پر پڑے تھے ان کے ناک اور منہ سے خون بہہ کر
خشک ہو گیا تھا۔ انھوں نے خود کشی کوئی تھی۔

میں ادارہ علوم شرقیہ کا طالب علم تھا۔ وہ استاد تھے۔ میرے گھر آتے جاتے تھے۔ ان کی تلاش میں پولیس نے پہلے ہی ہم سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی۔ میں شبہ میں پکڑ لیا گیا۔ اور میرے دشمنوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور میرے رقیب نے کوئی دقیقہ میری بربادی کا اٹھانہ رکھا۔

اس نے جلتے ہوئے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگایا اور خلاؤں میں گھورنے لگا مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شاہ صاحب کے تیکے پر بیٹھا اپنے اطراف تھوکنے کا کام شروع کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔ لمحے بھر کے لیے اس کے چہرے پر وہ ساری کیفیات لہرا کے رہ گئیں جو زمانہ دیوانگی میں اس کا حصہ تھیں۔

میں نے اس داستان کو آج کی حد تک یہیں ختم کر دینا چاہا۔ لیکن میرے سامنے بیٹھا ہوا ابھی وہ میرے پاس موجود نہیں تھا، کہیں دور دور بھٹک رہا تھا۔ پھر یکایک وہ کہنے لگا۔ زندگی ایک بل میں کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ انسان اتنا عجیب و کیوں ہے۔ بعض وقت تو میاں پر ایمان اٹھ جاتا ہے۔ وہ بے گناہوں کو اتنی اذیت میں کس طرح دیکھ سکتے ہیں اور اگر تقدیر سب کچھ ہے تو کیا آدمی کچھ بھی نہیں ہے۔

میں نے گھسا پٹا وہی جملہ دہرایا۔ ”اور اپنے چہیتوں ہی کو تو آزماتا ہے۔“

لیکن وہ میرے اس جملے کی پہنچ سے کہیں آگے نکل چکا تھا۔ میں نے موضوع بدل دینا چاہا۔

”تمہارے والدین کہاں ہیں؟“

”زمانہ ہوا یہاں سے چلے گئے۔“

”پھر تم یہاں؟“

”میں بھاگ آیا ہوں۔ میں کہاں جاسکتا ہوں۔ کہیں بھی تو نہیں جاسکتا۔ نعیمہ جو یہاں دفن ہے۔ اس کے والد نے اس حادثے کے بعد جب مجھے سزا ہو گئی تو اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیا۔ نعیمہ نے خودکشی کر لی۔ نعیمہ — اور قبر کی تادمیچی — اس کا عذاب۔ اُن“

”چلو چلیں۔ یہاں سے۔ مجھے بڑی دحشت سی ہو رہی ہے۔“

وہ یکایک اٹھا۔ جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس نے بل ادا کیا۔ کاؤنٹر سے دو روپے اور کچھ ریوگامی لے کر تیزی سے سڑک پر پہنچ گیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا تو سینٹ کی سڑک پر میرے جوتوں کی کھٹ کھٹ نے علی زور کے قدموں کی اس چاپ کی یاد دلائی جس کی تفصیل ابھی ابھی ٹرٹرا نے بیان کی تھی۔

میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے رک کر بڑے غور سے میرے قدموں کی چاپ سُنی۔

میں نے اس کو دیکھا تو وہ شرافت اللہ خاں کہیں نہیں تھا۔ جس کے ساتھ اتنا وقت میں نے ابھی ابھی کیفے میں گزارا تھا۔

میرے سامنے تو وہی دیوانہ ادھی پاگل کھڑا ہوا تھا جسے لوگ مجھ سے سمجھتے اور جس کے جذبہ دردوں کی باتیں کرتے تھے۔ دھجی دھجی

..... لباس اور تار تار دامن میں جو قریب قریب روز ہی تجھے شاہ صاحب
کے تیکے پر ملتا تھا اور جو میرے قدموں کی چاپ سے کبھی کبھی چونک جاتا تھا۔
اب جو دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے کھڑا تھا اس نے البتہ ڈھنگ کی شیرازی
پہن رکھی تھی اور خملی دوپٹی اوڑھتے ہوئے تھا۔

”دو آنے دے دے — صبح سے چائے نہیں پی ہے دے“

اس نے اپنے اطراف تھوکتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے آگے پھیلا دیا۔
میں بالکل بے بس تھا۔ میں اسے تیکے جا رہا تھا۔

”دیتا ہے کہ جاؤں — دے دے“

میں نے دو آنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس یقین کے ساتھ کہ شرافت
اللہ خاں کی جیب میں دو روپے ہیں لیکن اس دیوانے کو شرافت اللہ خاں
سے کیا لینا —

وہ دو آنے لے کر تیز تیز چلتا ہوا پھر ادلیا کیفے میں گھس آیا — اور میں
آج پھر ایک گلستاں کو دیرانے میں تبدیل ہوتا ہوا اس طرح دیکھتا رہا جیسے کہیں
کچھ ہوا ہی نہیں۔

آرزدوں کے ایک شہر کو محرومیوں کا کھنڈر بنتا ہوا اس طرح دیکھتا رہا
جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

چند عمدہ افسانوی مجموعے

۱۶ روپے	اقبال مجید	دو بھیگے ہوئے لوگ
۱۶ روپے	اقبال متین	نچا ہوا البم
۵ روپے	رتن سنگھ	پہلی آواز
۱۰ روپے	"	پنجرے کا آدمی
۱۵ روپے	جو گندہ پال	رسائی
۸ روپے	عابد سہیل	سب سے چھوٹا غم
۷ روپے	سلمیٰ صدیقی	مٹی کا چراغ
۵ روپے	منظر حقیقی	دو غنڈے
۱۶ روپے	نور پرکار	سبزہ بیگانہ (مواضع کہانیاں)
۵ روپے	یوسف ناظم	فٹ نوٹ (طنز و مزاح)
	ناول	
۱۶ روپے	کوشن چند	آئیے اکیلے ہیں
۶ روپے	"	مشیروں کا شہر
۱۰ روپے	"	آدھا آستہ

نصرت پبلشرز

کیو مارہ کیٹ - وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ - ۳